سفر

مهنا زریع

Brite Books
Lahore-Pakistan

''جملہ حقوق محفوظ ہیں''

نام کتاب: سفر

مصنفہ: مہناز رفیع

ناشر: اے۔ایم شکوری

ٹائیٹل: ہارون رفیع

کمپوزنگ: عرفان علی اشرف

0321-4700355

پبلشرز: برائٹ بکس:

سال اشاعت: 2013

قیمت: 250/-

پرنٹر: پرنٹ یارڈ پریس ریٹی گن روڈ لاہور۔

فہرست

1	اظہار تشکر	3
2	انتساب	4
3	پیش لفظ	5
4	کتاب کے ''سفر'' کا عنوان	8
5	کتاب لکھنے کے محرکات	11
6	میری زندگی / میں مہناز رفیع	27
7	میں سوچتی ہوں	40
8	پاکستان کی آبادی، ایک لمحہ فکریہ	42
9	عورتوں پر تشدد	45
10	قانون اور عورت	49
11	خواتین کے آئینی حقوق	51
12	عورتوں کی ذہنی ترقی میں خواتین کا کردار	53
13	آئین پاکستان اور عورت	59
14	دوسری شادی	63
15	جہیز اور شادی کا خرچ	64
16	نکاح	66

17	نام	71
18	ملازمت	72
19	آمدنی	75
20	طلاق	76
21	شادی	79
22	خواتین کی تعلیم اور قومی ترقی۔	80
23	پاکستانی عورتوں نے کیا کھویا۔ کیا پایا؟	85
24	1886ء سے 1988ء تاریخی پس منظر	88
25	ملک کی ترقی عورتوں کے تحفظ سے مشروط ہے	100
26	انتہا پسندی کے سایہ میں ترقی.....؟	104
27	تعمیر پاکستان میں خواتین کا کردار	107
28	قومی ترقی میں خواتین کا کردار	114
29	خواتین کی سیاست میں شمولیت (پارٹ اول)	117
30	خواتین کی سیاست میں شمولیت (پارٹ دوئم)	125
31	خواتین اور پارلیمنٹ	129
32	مسلمان خواتین میں حقوق سے آگاہی	132
33	خواتین کی عالمی کانفرنس	136
34	بیگم مہناز رفیع.....سیاسی جدوجہد کی تاریخ	144
35	حقوق کی جنگ، مسلمانوں عورتوں کا کردار۔	147

اظہار تشکر

اس کتاب کے حوالے سے جن لوگوں نے میری مدد کی خصوصاً ''**اے۔ایم۔شکوری**'' جو اس کتاب کے پبلشر بھی ہیں۔ ''**سید ممتاز رضا**'' اور کتاب کا خوبصورت ٹائٹیل بنانے والے ''**ہارون رفیع**'' ان سب کی میں شکر گزار ہوں۔

مہناز رفیع

”انتساب“

یہ کتاب اُن لوگوں کے نام جنہوں نے خواتین کے حقوق کی
جنگ لڑی۔

''پیش لفظ''

اچھی کتاب کے لئے یہ فارمولہ از حد ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اس کے آغاز سے پہلے ''پیش لفظ'' ہونا ضروری ہے۔ اور کسی سکہ بند ادیب کا دیباچہ بھی ہونا چاہئیے۔ اور اگر کسی ''پیشہ ور'' نقاد کی رائے بھی ہو تو کتاب مستند ہو جاتی ہے اور لکھاری کی کاوش کامیاب ہو جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نقاد کی رائے اور ادیب کا دیباچہ پہلے سے ٹائپ شدہ ہو اور صرف نام اور چند پیراگراف تبدیل کر دیئے جائیں۔

پیش لفظ میں لکھنے والا گویا اپنا ''دل'' کھول کے رکھ دیتا ہے کہ اس کتاب کے آنے تک کیا کیا مشکلات درپیش رہیں لکھنے والا تخلیق کے ''در دزچگی'' سے کس طرح نڈھال رہا ہے۔۔۔۔ یہ فارمولہ ممکن ہے ادبی نگارشات کے لئے ضروری ہو۔ لیکن میری اس کتاب کے لئے ہرگز ناگزیر نہیں ہے۔

لیکن کیا کیا جائے کہ میں بھی ''روایات'' کی پاسداری کرتے ہوئے پیش لفظ سے آغاز کر رہی ہوں۔ حالانکہ نہ تو اس کتاب میں کسی خود ساختہ دانشور کی ذہنی تسکین کا سامان ہے اور نہ ہی کسی نقاد کے لئیے کوئی ''مصالحہ'' کہ وہ اس کتاب کو پسندیدگی کا اعزاز بخش کر ہمیشہ کے لئے ''امر'' کر دے۔۔۔۔ یہ میری کوشش، میری فقط اُس جدوجہد کا ثمر ہے جو میں نے ایک عورت ہونے کے ناطے عورتوں کے لیے کی۔۔۔۔ میرے اس سفر میں کیا

مشکلات رہیں۔۔۔کن لوگوں کے رویے سے دکھ پہنچا،اس کا تذکرہ بھی ضروری نہیں ہے۔

وہ ساتھی ، وہ دوست جواس قافلے میں میرے شریک سفر تھے اور ہیں اور رہیں گے ان کے لئے جو جنگ لڑی۔اس میں کامیابیاں سمٹیں۔اگر چہ یہ جنگ پوری طرح جیتی نہیں جاسکی لیکن میں مایوس نہیں ہوں کہ کبھی کبھی جہد و جہد کا نتیجہ دیر سے سامنے آتا ہے۔

صدیوں کے تاریک، ''بہیمانہ طلسم'' کا توڑ کسی آسان منتر سے ممکن نہیں ہوتا،کہنہ رسوم،فرسودہ رواج ظالم روایات کی دیواریں جو ہمیں صدیوں سے قید میں لئے ہوئی ہیں۔ ان کوتوڑنا کم وقت میں ہرگز ممکن نہیں ہے۔مذہب کے جھوٹے ٹھیکیداروں،ادیان کے بہکے ہوئے گائیڈوں'' اور بگڑے ہوئے سماجی،سیاسی رہنماؤں کے بنائے ہوئے خوف کے بادل ،جھوٹ کے آسمان،منافقت کے محل آسانی سے مسمار نہیں ہوسکتے۔جنگل میں بھڑکتی آگ کے شعلوں کو دیکھ کر ایک ننھے سے پرندے نے قریبی جھیل سے چونچ میں پانی بھرا اور دہکتے ہوئے شعلوں میں پھینکا۔وہ دیر تک یہی عمل کرتا رہا.....آگ کے شعلے اور بلند سے بلند تر ہوتے چلے گئے۔اس عمل میں پرندے کو نڈھال دیکھ کر اس کے ساتھی پرندے نے کہا'' یہ آگ بجھانا تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔آگ کے لپکتے شعلوں کو دیکھو اور اپنی چونچ میں پانی کی مقدار کو دیکھو۔۔۔اس پرندے نے جواب دیا'' میں جانتا ہوں اس آگ کو میں نہیں بجھا سکتا۔لیکن یہ وقت گواہ رہے گا کہ کل جب اس آگ کا ذکر ہوگا تو میرا نام بھی آگ بجھانے والوں میں ہوگا''

اس کہاوت کو بیان کرنے کا مقصد فقط اتنا ہے کہ ظلم پر احتجاج نہ کرنا بھی ایک ظلم ہے۔ہم نے عورتوں پر روا سلوک کے لئے جدوجہد کی ۔سڑکوں پر نکلے، پابند سلاسل ہوئے۔حاکم وقت کے معتوب ٹھہرے۔گھروں میں رہنے پر پابند کیا گیا۔لیکن اس کے باوجود مقدور بھر کوشش کرتے رہے کہ عورت کو بھی **''عورت''** ہونے کا حق دیا جائے۔ایوان میں صدا بلند کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کئی قوانین عورتوں کے لئے بنے۔اور کئی قوانین میں ترامیم ہوئیں۔

میری یہ کاوشیں سعی لا حاصل نہیں ہے۔۔۔۔اس سفر میں جو جاری وساری ہے۔ منزل ہمارا مقدر ہے۔ یہ میرا یقین ہے۔

اس کتاب کے پیچھے یہ مقصد ہے کہ شاید اسے پڑھ کر کچھ اور لوگوں کو بھی حوصلہ ملے اور وہ بھی اس جدوجہد میں ہمارے شریک بنیں۔۔۔۔۔نتائج دیر سے ہی سہی ملتے ضرور ہیں۔ کسی بھی انقلاب اور تبدیلی کے پیچھے صدیوں کی تپسیا شامل ہوتی ہے۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اگر اس کتاب کے ایک قاری تک بھی میرا پیغام پہنچتا ہے تو میں سمجھوں گی میری کوشش رائیگاں نہیں گئی۔

☆☆☆☆☆☆

کتاب کے ''سفر'' کا عنوان

(سینیٹر ایس ایم ظفر)

کتاب کے ''سفر'' کا عنوان اور اِس سفر میں کی جانے والی جدوجہد (یا حقوق خواتین کے لیے جہاد) جس میں اُن کو ان گنت اور طرح طرح کی رکاوٹوں کا سامنا رہا۔ اس پر مجھے منیر نیازی مرحوم کا یہ شعر یاد آرہا ہے۔

''منیر اس ملک پر آسیب ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ''

مہناز رفیع نے تو منزل تک پہنچنے کے لیئے راستہ میں ہر سائن بورڈ تک اپنی حرکت تیز تر رکھی لیکن معاشرے کی راسخ قنوعیت اور مرد شاونزم (MALE CHAUVINISM) ایک ایسا آسیب تھا (اور ہے) کہ جس نے سفر آہستہ کیئے رکھا۔

مہناز رفیع کے اس سفر نامہ کے مطالعہ سے اِن کی کوششوں کا مکمل احاطہ ہو جاتا ہے اور کتاب کا ہر قاری ان کو اپنے انداز میں خراج تحسین ضرور دیگا۔

ایک ھیومن رائٹس، ایکٹیوسٹ (ACTIVIST) کے طور پر انسانی حقوق کی خلاف ورزی اور ایسے قوانین جو خاص طور پر خواتین کو ٹارگٹ کرتے تھے ان کے خلاف کلمہ حق کہنے پر جیلیں کاٹیں (ان کے ایک مقدمہ میں مجھے بھی ان کی طرف سے لاہور ہائی کورٹ میں پیروی کرنے کا موقعہ ملا۔ تفصیل میری کتاب ''میرے مشہور مقدمے'' میں موجود ہے جب پارلیمان میں پہنچ گئیں تو خواتین کے حقوق اور ان کے نفاذ کے لیئے قوانین بنوائے۔

بین الاقوامی کانفرنسوں میں پاکستانی معاشرہ اور خصوصی طور پر خواتین کے موقف کی نمائندگی کی۔ جو کچھ وہاں سے سیکھا اور حاصل کیا اب ''سفر نامہ'' میں قارئین کے سپرد کر دیا ہے تا کہ وہ بھی ''گلوبل سوچ'' سے آگاہ ہو جائیں۔

خواتین کو اسمبلیوں میں اور لوکل نظام میں 17 فیصدی تک نمائندگی مل جانے کو جائز طور پر اپنی کوششوں کی اور عمومی جدوجہد کی وجہ سے ممکن قرار دیتی ہیں لیکن ان کے خیال سے اتنی نمائندگی کافی نہیں ہے۔ بلکہ وہ امید کرتی ہیں کہ ایسی تبدیلی ملک میں ضرور آئیگی جب یہ نمائندگی 35% ہوگی اور سیاسی جماعتیں بھی اپنے امیدواروں میں خواتین کو جگہ دیں گی۔

اب وہ قومی اسمبلی کی ممبر نہیں رہ گئی ہیں۔تو کیا ہوا میدان جدوجہد ابھی بھی وسیع ہے اور ان کا سفر جاری ہے۔ یقین کرتی ہیں کہ ایکدن حرکت اور سفر میں مطابقت پیدا ہو جائیگی۔

میری مہناز رفیع سے اس وقت کی ملاقات ہے جب میرے کلاس فیلو محمد یحییٰ کے نکاح میں آئیں۔دونوں میاں بیوی مجھ سے اور میرے خاندان سے احترام اور دوستی کا جذبہ رکھتے ہیں۔

اور اب ھیومن رائٹس سوسائٹی آف پاکستان میں جس کا میں چیئرمین ہوں اور محترمہ سینئر وائس چیئر پرسن ہیں وہ ہر میٹنگ اور اجلاس میں باقاعدہ شریک ہوتی ہیں۔اور قابل قدر کنٹری بیوشن (CONTROBUTION) کرتی ہیں۔ یہ سلسلہ چالیس سال کے قریب ہو چلا ہے۔

چونکہ مہناز رفیع تبدیلی چاہتی ہیں اور وہ اپنی گذشتہ جماعت مسلم لیگ (ق) سے اس معاملہ میں ناامید ہو گئیں۔انہوں نے جماعت تبدیل کر لی کہ تحریک انصاف تبدیلی کی داعی ہے ہم دعا گو ہیں کہ جہاں رہیں ان کی عزت مانی جائے اور وہ اپنا جہاد اور یہ سفر جاری رکھیں۔

یہ قابل ذکر ہے کہ انہوں نے اس سفر میں صرف اپنا ذکر نہیں کیا بلکہ کئی ہمسفروں کو بھی خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اوران خواتین کا احسن الفاظ میں ذکر کیا ہے جنہوں نے تحریرًا یا عملاً خواتین کی نمائندگی کی ہے۔

اگرچہ مسلم لیگ چھوڑ چکی ہیں۔ لیکن قائد اعظمؒ کے اصول جو مسلم لیگ کے منشوروں میں درج ہوتے رہے ہیں وہ ذہن میں عکس ہیں اوران کا بار بار ذکر اس سفر نامہ میں پایا جاتا ہے۔ میرے نزدیک وہ جس پارٹی میں ہوں اصلی اور حقیقی وہ مسلم لیگی ذہن ہی کی ہیں۔

برائٹ بکس کا ذکر بھی ضروری ہے کہ وہ پاکستان کے مشاہیر کے حوالہ سے عمدہ کتابوں کی دیگر ناشران سے بڑھ کر اشاعت کرتے رہے ہیں۔

☆☆☆☆☆

کتاب لکھنے کے محرکات

میں بنیادی طور پر کوئی مصنفہ نہیں ہوں اور نہ ہی یہ دعوٰی ہے کہ میری تحریر میں فلسفیانہ موشگافیاں، بلند پرواز خیال، کوئی نیا نظریہ انسانی یا کوئی انوکھی فکر و دانش ہے۔

اس کتاب کو منظر عام پر لانے کا مقصد نہ تو خود ستائشی ہے۔ نہ ہی اپنی کاوشوں کی داد مقصود ہے۔ اور نہ ہی سیاسی پنڈتوں، بنیادی حقوق کے نام نہاد ٹھیکیداروں سے واہ واہ کے نعرے سننے ہیں۔

اس کتاب کا مقصد فقط عورتوں کو ان کے حقوق سے آگہی دنیا ہے۔۔۔ تا کہ انہیں بھی معلوم ہو سکے کہ وہ بھی دیگر تمام انسانوں کی طرح ''جان دار'' مخلوق ہیں۔۔۔ بھیڑ بکریاں نہیں۔

اس میں، میں نے اپنی مقدور بھر کاوشوں کا تذکرہ بھی کیا۔ اگر چہ میں سمجھتی ہوں کہ میں نے اپنی زندگی میں عورتوں کے حقوق کی خاطر جو کام کیا ہے۔ وہ میرے خیال میں کم ہے۔ اس سے زیادہ کرنا چاہئے تھا۔ یا ہو سکتا تھا۔ اور اس سفر کو ہم اپنی تمام تر کاوشوں، لگن سے جاری رکھتے ہوئے! چاہے سفر کتنا ہی طویہ ہو۔ حقوق نسواں کی یہ طویل ساخت ہمارے پاؤں سے تھکن کی زنجیر باندھ سکے گی۔

اس قافلہ میں اور بھی لوگ شریک سفر رہے۔ اُس جنگ کو ہم آج بھی لڑ رہے

ہیں۔۔۔۔اور نہ ہی ہم شکست خوردہ ہیں اور نہ ہی طویل مسافت ہمارے پاؤں سے تھکن کی زنجیر باندھ سکی ہے۔

یہ مردوں کا معاشرہ ہے۔مرد عورت پر حکمران ہے حتیٰ کہ وہ اس کے جسم کے ساتھ اس کے ذہن اس کے دل اور اس کی سوچوں پر بھی حکومت کرنا چاہتا ہے۔ جہالت اور غربت سے غلامی کا جنم ہوتا ہے۔ جہالت ہی غیرت جیسے رویے کو جنم دیتی ہے۔جس معاشرے میں 60 فی صد لوگ آزادی اور بے راہ ہروی کے درمیان فرق سے واقف نہ ہوں۔ وہاں کون سے حقوق؟ اور کیسے عزت نفس کی پاسداری ممکن ہے۔

فرسودہ تہذیبوں، غیر متمدن معاشروں ، جاہل حکمرانوں کی ریاستوں، ظالم روایات میں جکڑی تہذیبوں میں عورت کا درجہ ایک کم تر، جاہل، کم علم عورت کا رہا ہے۔ کسی جگہ پر تو عورت کو انسان ہی ماننے سے انکاری ہیں۔ کچھ معاشروں میں عورت کو شیطان کا درجہ بھی دیا گیا۔

حوا کی بیٹی، یشودھا کی ہم جنس ہمیشہ سے جنسی استحصال، محرومی، اور پابندیوں کا شکار ہی ہے۔عورت کو آج بھی پاؤں کی جوتی کہا جاتا ہے۔

ماضی کے بدکردار، عیاش حکمران عورتوں کے حرم آباد کرتے تھے۔ اپنے مہمانوں کو بڑے فخر سے ان احرام کی سیر کراتے تھے۔ جہاں وہ عورتیں بستی تھیں جن کی کہیں دادرسی نہیں تھی۔ جنہیں ہر رات بھوکے بھیڑیئے، ہوس کے غلام اپنی خواہشات نفسانی کے لئے پامال کر دیا کرتے تھے۔

جس عورت سے جی بھر جاتا اُسے کسی اور کو تحفتاً دے دیا جاتا۔ بسا اوقات حرم کی یہ عورتیں محلات کے ادنیٰ ملازمین کو بھی دان کر دی جاتی تھیں۔

معاشرتی تبدیلیوں کے باعث حرم ختم ہو گئے۔لیکن عورت کو وہ مقام، مرتبہ، نہیں مل سکا اور نہ ہی اس کی حیثیت اور اہمیت کو تسلیم کیا گیا۔

پاکستان وڈیروں، جاگیرداروں کی جنت ہے۔آج بھی سندھ، بلوچستان، سرحد

اور پنجاب کے دور افتادہ علاقوں میں عورت اُسی رویے اور ظلم کا شکار ہے، جو وہ برسوں سے جھیلتی آتی ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب عورت کو اس کا حق دیتے ہیں کہ مذاہب کی بنیاد اخلاقیات اور انصاف پر مبنی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی مذہب کسی بھی عورت کو ادنیٰ درجہ و مقام پر رکھے ہوئے ہے۔

لیکن اسے بدقسمتی ہی کہا جا سکتا ہے کہ مذاہب اور ادیان کے نام نہاد ٹھیکیداروں نے انہی مذاہب کا سہارا لیکر عورت کو ادنیٰ مخلوق گردانا اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

عورت کی حیثیت سے کوئی بھی معاشرہ انکار نہیں کر سکتا۔ عورت، ماں، بیٹی، بہن اور بیوی کے روپ میں اعلیٰ حیثیت کی مستحق ہے لیکن صورتحال کہیں کہیں اس سے یکسر مختلف ہے۔

زمانہِ قدیم میں یورپ اور امریکہ میں بھی خواتین اسی طرح کی بدترین صورتحال کا شکار رہی ہیں۔ کلیسا کے عورتوں پر روا مظالم کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔۔۔۔ لیکن سیاست اور حکومت میں کلیسا کا اثر ختم ہونے کے سبب عورتوں کو بھی بہتر اور برابری کی سطح پر جینے کا حق ملا۔۔۔۔ اور پھر تعلیم نے جو ذہنی کشادگی ترقی پسندانہ سوچ بخشی اس کے نتیجہ میں بھی عورت کو معاشرہ میں جائز مقام کا حقدار گردانا گیا۔

مادام کیوری، ایملی برونٹے، شارلٹ برونٹے جیسی عورتوں نے ادب اور سائنس کے میدان میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جن کی مثال نہیں ملتی۔

عورت کبھی مصر کے بازاروں میں بکی، کہیں کوٹھوں پر نچوائی گئی۔ آبرو کی نیلامیاں ہوئیں، کبھی رنڈی، کبھی ویشا تو کبھی بیسوا کہلائی۔

کئی زلیخاؤں کے دامن میں بدنامیوں کے داغ لگے۔ کئی سسیوں کے پاؤں تھل کی گرم ریت سے جھلسے۔ کئی سوہنیاں دریاؤں کی لہروں میں غرق ہوئیں۔ کئی ہیریں کھیڑوں کے ساتھ وداع ہو گئیں۔

لیکن اگر تاریخ عالم کے اوراق الٹیں تو عورت کبھی مریم، کبھی آسیہ، اور کبھی سیتا کی

طرح مقدس اور پاکیزہ بھی نظر آئی۔

ہم جاہل معاشرے کے پروردہ عورت کی تذلیل کرتے ہوئے۔ الجزائر کی جمیلہ، ایران کی قراۃ العین طاہرہ، ہندوستان کی رضیہ سلطان کو کیوں فراموش کر دیتے ہیں۔

وہ عظیم ہستی، وہ قابل احترام عورت جنہیں دنیا کی پہلی انقلابی عورت لکھتے ہوئے مجھے فخر محسوس ہو رہا ہے نے جب یزید کے دربار میں کلمہ حق کہا۔ زندان مقدر بنے، شام کے بازاروں میں پا پیادہ پھیرایا گیا لیکن انہوں نے اصولوں کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کیا آمر کی آمریت کو ماننے سے انکار کیا، اور عین قرآن کے کہنے کے مطابق جابر سلطان کے سامنے نعرہ حق بلند کیا۔

ہم مسلمان ہونے کے ناتے یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ جب ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے سامنے ان کی پیاری بیٹی آتیں تو آپ ان کے احترام میں کھڑے ہو جاتے۔

آپ رسول پاک صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے عرب کے جاہل بدووں کو جو بیٹی کی پیدائش ہوتے اسے زمین میں گاڑ دیتے اس قبیح رسم اور اس ظالمانہ فعل سے روکا۔

اسلام نے صحیح معنوں میں عورت کو اس کے حقوق دیئے۔ ہم اسلام کے تو نام لیوا ہیں۔ لیکن عورت کے حقوق سے انکاری ہیں۔ یہ عجیب دورخی اور منافقت ہے۔۔

ہمارے معاشرے میں عورت کی حیثیت کم تر ہونے کی ایک وجہ ہماری حکومتیں اور حکمران بھی ہیں ضیاء الحق کے خوفناک، بھیانک اور سیاہ دور میں اسلام کے نام پر جو ''ضیاء الحقی قانون سازی'' کی گئی اس نے عورت کی حرمت پر کاری ضرب لگائی۔

اُس سیاہ، بھیانک آمریت کے دور میں بونے، بالیشتے، دولہ شاہ کے چوہے جیسے دماغ رکھنے والے قانون سازوں نے قانون کے نام پر جو اسلام کی غلط تشریح کرتے ہوئے ''تعزیری قانون'' تشکیل دیئے۔ ان ظالم اور غیر انسانی قوانین کی مثال تواریخ سے ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملتی۔ ہاں زمانہِ قدیم میں جب انسان گروہوں اور قبیلوں میں بٹا ہوا تھا،

اس قسم کے قوانین سے عورت کا سابقہ رہا ہے۔ لیکن اس دور کے قوانین فرد واحد (سردار یا حکمران) کے ذاتی فوائد کو مدنظر رکھتے ہوئے فرد واحد یا چند مراعات افراد کے تشکیل کردہ تھے

۔

''ضیاء الحقی'' دور کے مصاحبین کی اکثریت ذہنی سطح، فہم وشعور، ادراک وفکر اور نظریات کے حوالے سے پاکستان میں بسنے والی بہت سے عورتوں سے کم تھے۔ لہٰذا ان کی مردانہ انا اس بات کی اجازت کیونکر دیتی کہ عورت کسی بھی لحاظ سے ان سے اعلیٰ نظر آئے۔

''چادر اور چار دیواری'' کا نعرہ لگانے والی حکومت نے اپنے ہی منشور، نظریہ اور نعرے کو سبوتاژ کیا۔ ایم۔ آر ڈی کی تحریک اور پھر حقوق نسواں کے لئے اٹھنے والی ہر آواز کو دبانے کے لئے ہر حربہ اختیار کیا گیا۔ عورتوں کو وحشی پولیس آفیسرز نے سڑکوں پر گھسیٹا، ٹھڈے مارے گئے۔ ان کی چادروں کو چاک کیا گیا۔ گریباں تار تار کر دیئے۔ اس وقت کسی وڈیرے، سیاسی گماشتے، کسی قانون ساز نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ جن روشن خیال سیاست دانوں، دانشوروں نے اس کے خلاف آواز بلند کی ان پر زیست تنگ کر دی گئی۔ نوکریاں چھینی گئیں۔ پابند سلاسل کئے گئے۔ سرعام کوڑے مارے گئے۔ ان سے بھی گویا جینے کا حق چھین لیا گیا۔

مختلف آرڈیننسز کے تحت پولیس جب چاہتی چار دیواری کی حرمت کو پامال کر دیتی۔ جب چاہتی عورت کی چادر کو بستر کی زینت بنا لیتی۔

میرے دیس کی عورت نے بہت دُکھ سہے ہیں۔ اُس دور میں ننھی بچیوں کی آنکھوں کے خواب چھین لئے گئے جن آنکھ میں کبھی سپنے بستے تھے وہاں اب شفاف موتی لرزتے تھے۔ جو بچیاں کالجوں میں پڑھتی ہوئی یہ خواب بنتی تھیں کہ ہم ڈاکٹر بنیں گی۔ ہم وکیل بنیں گی، ہم جہاز اُڑائیں گی مستقل اس اندیشے کا شکار ہو گئیں کہ کسی کزن یا عزیز کے ساتھ جاتے ہوئے حدود آرڈیننس میں گرفتار نہ کر لی جائیں۔ وہ نسل آج بھی ذہنی طور پر عدم تحفظ کا شکار ہے۔

اُسی دور کے پیدا کردہ مصائب اور مسائل کا نتیجہ آج بھی ہم بھگت رہے ہیں۔ مذہب ہر انسان کا ذاتی معاملہ ہے۔لباس وزیبائش پر کوئی قانون کسی بھی متمدن معاشرے میں متصادم نظر نہیں آتا۔ یہ مخصوص گروہ کا سیاسی مصلحتوں کے زیر اثر ایک وقتی رویہ ہوتا ہے۔ جسے قانون بنا کر عورت پر مسلط کر دیا گیا۔۔۔۔

شاعر مشرق ''ڈاکٹر علامہ اقبالؒ'' کا کہنا ہے

''وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ''

اس شعر کی تشریح اس طرح نہیں کہ عورت کے جسمانی خدوخال، چہرے کے نقوش، غزالی آنکھیں، احمریں ہونٹ، مرمریں بانہیں، گھنیری زلفیں کائنات میں رنگ بھر دیتی ہیں۔کوئی بھی ماں اپنے بچے کی پہلی اُستاد، مبلغ اور مصلح ہوتی ہے۔ بچے کی تربیت کا آغاز ماں کی گود سے ہوتا اور پھر شعور کی حدوں تک وہی تربیت اس کی شخصیت کا حصہ بن جاتی ہے۔ یہی بچے جب زندگی کے میدان میں کامیابیاں سمیٹتے ہیں، بنی نوع انسان کی آسانیوں کے لئیے ایجادات کرتے ہیں۔

معاشرے کے لئے ایک مفید اور پُر امن رویہ اختیار کرتے ہیں۔۔۔ان کی مثبت سوچ دیگر انسانوں کے دکھ، کرب کم کرتے ہیں تو پھر کئی رنگ بکھر جاتے ہیں۔

ہم نے عورت کو یا تو پھر پستی کے اندھیروں میں دھکیل دیا یا پھر ایک نمائشی چیز کے طور پر پیش کیا۔کہانیاں معاشرے کے افراد کے مسائل سے جنم لیتی ہیں۔زمانہِ جدید میں کہانیاں فلموں اور ڈراموں میں ڈھل گئیں، ان کہانیوں میں اگر ہم نے کسی طوائف کو بھی پیش کیا تو گلیمرس کر کے۔خوبصورت سجاوٹ سے آراستہ بالا خانوں میں طبلے کی تھاپ پر ناچتے ہوئے پیش کیا۔لیکن ہم ان کہانیوں میں اور ان خوبصورت عورتوں کے سحر میں اس جسم فروش کسبی کو بھول گئے جو صرف اس لئے اپنا جسم بیچتی ہے کہ وہ اپنے خاوند کے لئے منشی اشیاء ،خرید سکے یا پھر بھوک سے بلکتے ہوئے بچے کے دودھ کے لئے کچھ روپے کما سکے۔

کہانی کاروں، فلمسازوں، دانشوروں نے بھی اپنی ذمہ داریاں کما حقہ پوری نہیں

کی ہیں اُردو اور فارسی شاعری اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ ہر جگہ عورت نظر آئے گی۔ عورت کے حسن کی تعریف کے لئے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے گئے، لیکن ان شاعروں کا اپنی گھر کی عورت کے ساتھ کیا سلوک رہا، اس پر ہمیشہ پردہ ہی رہا ہے۔

میں جانتی ہوں اگر چہ عورت کا ''کل'' آج کی نسبت بہت بہتر ہوگا۔ کیونکہ اب لوگوں میں شعور پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن ابھی بھی اس پر بہت کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہماری سول سوسائٹی سیاست دانوں، این، جی اوز کے نمائندوں، الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا سے وابستہ افراد کی یہ ذمہ داری ہے وہ عورت کے لئے آسانیاں پیدا کر لے۔ ان کے مسائل کو اجاگر کرے۔ ظالم رسموں اور بے رحم رواجوں کی ختم کرنے کی کوشش کرے تو عورت کو بھی انسان ہونے کا حق مل جائے گا۔

جہاں آمریت، ناخواندگی، غربت اور ''لا اینڈ آرڈر'' کی صورتحال از حد خراب ہے، وہاں عورت استحصال کا شکار ہے۔ خواہ وہ براعظم ایشیاء کا کوئی خطہ ہو یا افریقہ کا کوئی ملک جنوبی امریکہ کی کوئی ریاست یا مشرقی یورپ کا کوئی پسماندہ ترین ملک۔

آج جب دنیا ایک گلوبل ویلج کی شکل میں ڈھل گئی ہے۔ سیلولر فون، سیٹلائیٹ اور انٹرنیٹ کے ذریعہ پوری دنیا رابطے میں ہے، دور افتادہ ممالک میں رونما ہونے والے واقعات اور حادثات سے پوری دنیا منٹوں میں باخبر ہو جاتی ہے۔۔۔۔ پل پل کی خبریں ہمیں مل جاتیں ہیں۔ سائنس دان حتیٰ کہ آنے والے طوفانوں، اور دیگر قدرتی آفات کی خبر قبل از وقت دے دیتے ہیں۔ لیکن اس تمام ترقی، سائنسی ایجادات اور اقوام متحدہ کے تحت تشکیل کردہ مختلف اداوں، ایمنسٹی اور فعال این جی اوز کے باوجود عورت پر ظلم اور جبر کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ اور یہ صرف پسماندہ، غریب ترقی پذیر ملکوں کی عورتوں کا مقدر نہیں بلکہ ترقی یافتہ اور ان ملکوں کی عورتوں کے ساتھ بھی روا رکھا جاتا ہے جو اپنے آپ کو سپر پاور کہتے ہیں۔

امریکہ جیسے جدید اور ترقی یافتہ معاشرے میں جہاں جنسی گھٹن نہیں اور شخصی آزادی

اور عزت نفس کا خیال رکھا جاتا ہے۔ وہاں بھی عورتوں کے ساتھ بسا اوقات اس طرح کا سلوک ہوتا ہے کہ سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

سال 2005ء میں 5 ستمبر کو کروشیا کے شہر ڈیو بروونک'' میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی اس کانفرنس میں دنیا بھر سے 200 سائنس دان اور طبی ماہرین نے شرکت کی۔ کانفرنس کا موضوع تھا عدالتی تحقیقات میں استعمال ہونے والی طبی شہادتیں'' 6 ستمبر کے سیشن میں ساڑھے گیارہ بجے امریکی خاتون ''ڈیمورا اسمتھ'' کو مقالے پڑھنے کے لیے پکارا گیا۔ وہ مقالہ، مقالہ نہیں ایک استحصال زدہ عورت کی چیخ تھا۔ ایک دکھ تھا۔ اس مقالے کے کچھ اقتباسات میں آپ کی نذر کرتی ہوں۔

''جب مجھے فون پر دعوت دی گئی کہ میں اس کانفرنس میں شرکت کروں۔ اور مقالہ پڑھوں تو میں نے اسے اپنی عزت افزائی سمجھا۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ ادارہ میرے قیام وطعام سفر کے لئے بھاری اخراجات برداشت کر رہا ہے تو مجھے اس کانفرنس میں کوئی ایسی بات کرنا چاہیے جو سننے کے لائق ہو۔ جس کی کوئی اہمیت ہو۔ اور جسے سن کر حاضرین کو کسی قسم کی مقصدیت کا احساس ہو۔

میں نے کمپیوٹر پر بیٹھ کر زندگی کے حقیقی تجربے کو لفظوں کے حصار میں لانا شروع کر دیا۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ کتنی بار میں نے کئی پیراگراف لکھے پھر انہیں "Delete" کر دیا۔ کمپیوٹر کے حافظے سے محو کر دیا۔ میں نے لکھنا شروع کیا تو دھیرے دھیرے میری آنکھیں آنسوؤں سے دھندلانے لگتیں اور دکھ کی شدت سے دل گویا پھٹنے لگتا میں ایک بار پھر ''ڈیلیٹ'' کا بٹن دبا دیتی۔ الفاظ کے وجود کو ایک بار پھر عدم وجود میں تبدیل کر دیتی۔ بڑی مشکل سے میرے دل کو قرار آیا اور بڑی دقت سے میں ایسے الفاظ منتخب کر سکی

جو میرے محسوسات کی کافی حد تک صحیح انداز میں عکاسی کر سکیں۔ میرے دفتر میں ایک تختی لگی ہوئی ہے جس پر لکھا ہے ''الفاظ آپ کے دل کے ترجمان ہوتے ہیں''۔ اس کے باوجود میں آپ سے درخواست کروں گی کہ آپ میرے الفاظ پر توجہ ضرور دیجئے گا۔ لیکن اس سے زیادہ اپنے طور پر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کیجئے گا کہ درحقیقت ان الفاظ کے پیچھے کیا محسوسات ہوں گی۔ میں جس وقت کی بات کر رہی ہوں اسوقت میرے محسوسات کیا ہوں گے۔ اگر آپ کسی حد تک اندازہ کرنا چاہتے ہوں تو میرے ساتھ میری یادوں کی دنیا میں چلیے، جہاں 3 مارچ 1989ء کا دن ایک سنگ میل کی طرح کھڑا ہے۔ اس دن کی یادوں کی نقوش زخموں کی طرح میری روح پر کندہ ہیں۔

وہ ایک سرد، کہر آلود سہ پہر تھی، میں اپنے گھر جو ''ولیمز برگ'' کے ایک پر امن مہذب علاقہ میں تھا اس شہر کو ویسے بھی ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے نہایت پر امن اور جرائم سے بڑی حد تک پاک شہروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ میں گھر کے کام کاج میں اسی طرح مصروف تھی جیسے گھریلو خواتین ہوتی ہیں۔ ان تمام کاموں کے دوران میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا اس روز اچانک میری زندگی کا پانسہ پلٹ جائے گا۔ میں اس انقلاب سے دوچار ہوں گی جس کا میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

ہمارا عقبی دروازہ عموماً بند رہتا ہے۔ لیکن میں نے اسے اس خیال سے کھلا چھوڑ دیا کہ کوڑے کا بیگ باہر کوڑے دان میں رکھ آوں۔۔۔۔ اس کے بعد دوبارہ اندر آتے وقت اسے لاک کر دوں گی مگر میں کوڑے کا بیگ لے کر دروازے کی طرف کو گئی اس وقت تک ایک نقاب پوش دروازے کے راستے اندر گھس چکا تھا۔

وہ ایک مضبوط اور جسیم شخص تھا۔ اس نے بازو کے شکنجے میں میری گردن کو دبوچا اور میرے منہ پر سختی سے ہاتھ جما کر مجھے چیخنے سے باز رکھا۔ وہ مجھے گھسیٹتا ہوا میرے گھر کے عقب میں کچھ فاصلے پر واقع، درختوں کے ایک جھنڈ میں لے گیا جہاں اس نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ میرے جسم پر جو تھوڑی بہت جیولری موجود تھی، وہ اس نے

اُتر والی پھر میرے ساتھ جسمانی زیادتی بھی کی۔۔۔۔اس کی بے خوفی کا یہ عالم تھا کہ اس نے کافی دیر تک مجھے نہیں چھوڑا اور دوبارہ بھی اپنی نفسانی خواہش کی تکمیل کی۔۔۔۔

اس نے جب مجھے چھوڑا اور بھاگتا ہوا ایک سمت میں غائب ہو گیا تو میں گرتی پڑتی گھر واپس آئی میں نے اپنے شوہر کو بتایا کہ میرے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔۔۔۔۔ لیکن ساتھ ہی اس کی منت بھی کی کہ وہ پولیس کو اس سانحے کی اطلاع نہ دے اور نہ ہی اس سلسلے میں کوئی رپورٹ درج کرائے۔۔۔۔کیونکہ اجنبی نے جاتے وقت دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے ایسا کیا تو وہ دوبارہ آئے گا اور مجھے قتل کر دے۔ میں سخت دہشت زدہ اور حواس باختہ تھی۔لیکن میرے شوہر نے مجھے سمجھایا اور مجھے اس بات کی اہمیت کا بھی قائل کیا کہ مجھے فوری طور پر اسپتال چلنا چاہیے اور اپنی طبی معائنہ بھی کرا لینا چاہئیے۔

میری خواہش تو تھی کہ بس گرم پانی سے اچھی طرح غسل کروں اور کوئی سکون آور گولی کھا کر گہری نیند سو جاؤں میں غلاظت کے ایک نا قابل برداشت احساس کو گویا اپنے وجود پر سے دھو ڈالنا چاہتی تھی۔لیکن میرے شوہر کی رائے کچھ اور تھی۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے شوہر کو مجھ سے اتنی محبت تھی کہ اس واقعے نے اس کے دل میں کوئی دراڑ نہیں ڈالی اور یہ حقیقت اس کے پیش نظر رہی کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔

مجھے تو یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ میرے نہانے سے شاید غلاظت کا احساس تو پانی کے ساتھ نہ بہتا لیکن ایک اہم شہادت ضرور بہہ جاتی جس کی مدد سے آپ جیسے سائنس دانوں نے مجرم کی شناخت اور اس کی تصدیق کے طریقے دریافت کئے ہوئے ہیں۔ایسی ہی شہادتوں کی مدد سے مجرم کو کیفر کردار تک پہنچانا اور آئندہ کے لئے انسانوں کو اس کے شر سے بچانا ممکن ہوتا ہے۔ ورنہ وہ تو اپنا جرم کر کے اپنی دانست میں کوئی سراغ چھوڑے بغیر نکل چکے ہوتے ہیں۔

''میرے شوہر کا چہرہ بتا رہا تھا کہ سب سنکر اس پر کیا گزری ہے۔ میرے آنسو یقیناً اس کی اذیت کو اور بڑھا رہے تھے

مگر وہ اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے صحیح فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں تھا۔ اگر فیصلہ میرے شوہر کی بجائے میں نے کیا ہوتا تو آج میں یہاں کھڑی آپ کو اپنی زندگی کی کہانی نہ سنا رہی ہوتی۔''

میرا اسپتال جانے کا تجربہ بھی تقریباً اتنا ہی بھیانک تھا جتنا میرے ساتھ پیش آنے والا واقعہ، نرسیں اور ڈاکٹر اپنے کام میں ماہر ہوتے ہیں۔ پریشان کن خیالات میں بھی اپنے فرائض غیر جذباتی انداز میں انجام دینے کی انہیں عادت ہوتی ہے۔ وہ زخموں میں ٹانکے لگا کر بہتے خون کو روک سکتے ہیں۔ ڈوبتے دل کی دھڑکنیں دواؤں اور اپنی تدبیروں سے بحال کر سکتے ہیں۔ درد سے تڑپتے ہوئے انسانوں کو دوا کا انجکشن لگا کر کچھ دیر کے لئے راحت مہیا کر سکتے ہیں۔ ساکت ہوتے ہوئے پھیپھڑوں میں سانسوں کی آمد و رفت بحال کر سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان زخموں کا بھی مداوا کر سکتے ہیں جو زیادتی کا شکار ہونے والی لڑکیوں اور عورتوں کے اصل زخم ان کی روح پر ہوتے ہیں جو کسی کو نظر نہیں آتے ہیں۔

اگر کسی کو ان کی موجودگی کا تھوڑا بہت احساس بھی ہوتا ہے تو وہ بھی انہیں نظر انداز یا فراموش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ شاید لوگ سوچتے ہیں اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے؟ ڈاکٹروں کے پاس ایسی پٹیاں میں ہوتی ہیں جو دل اور روح کے ان زخموں سے بہتے ہوئے خون کو روک سکیں۔ ان کے پاس ایسا کوئی آلہ بھی نہیں ہوتا۔ کہ وہ متاثرہ عورت کے دل کی ہر دھڑکن میں شامل مجروح خیالات کو کسی طور الگ کر سکیں۔ وہ اس کی سانسوں کو بھی نارمل بنا سکتے ہیں مگر ان سانسوں میں شامل درد کی صداؤں کو نہیں دبا سکتے۔''

یہ ''مسز اڈیبی اسمتھ'' کے مقالہ کی چند لائنیں ہیں جن کو پڑھ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان پر کیا گذری ''ولمز برگ'' امریکہ کی رہنے والی اس خاتون کے ساتھ جب ریپ جیسا فعل ہوا تو وہ معاشرے سے کٹ کر رہ گئی۔ ہر قدم پر اسے گمان رہتا کہ کوئی اس کے تعاقب

ہے میں کئی بار اس کے ذہن میں خودکشی کا خیال ابھرا لیکن خوشی قسمتی سے ڈیبی اسمتھ'' امریکہ جیسے ملک کی شہری ہے۔ اس کے شوہر، اس کے عزیز دوست اسے یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئے کہ اس جرم میں تمہارا کیا قصور ہے۔ تم معاشرے سے کیوں منہ چھپائے ہوئے۔ لیکن اس کا دکھ اپنی جگہ پر تھا۔ اور خوف اور اندیشہ اس کا سایہ بن گئے۔ 26 جولائی 1995ء کو اُسے پتہ چلا کہ اس کے جسم سے لی گئی آلائشوں کے نمونوں سے زیادتی کے مجرم کی نہ صرف شناخت ہوگی ہے بلکہ وہ کچھ عرصہ سے کسی اور جرم میں جیل میں بند ہے۔ ساڑھے چھ سال کے عرصہ کے بعد اس نے پہلی مرتبہ ایسی سانس لی جو دُکھ سے بوجھل نہیں تھی۔ اس دن اُسے ایسا لگا کہ اس کی عزت اور اہمیت بحال ہوگئی ہے۔ اس سے پہلے مجرم کی حیثیت ایک بھوت یا آسیب کی سی تھی۔

''ڈیبی اسمتھ''، لکھتی ہیں کہ اپنے مقدمے کا فیصلہ ہونے کے بعد میں نے صدق دل سے خدا سے دُعا مانگی کہ وہ مجھے توفیق عطا فرمائے کہ میں اپنی جیسی عورتوں کی کچھ مدد کر سکوں۔ لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ میں تو محض ایک شرمیلی سی گھریلو خاتون ہوں۔

جس کی تعلیم بھی کچھ زیادہ نہیں۔ پھر میں بھلا بڑا کام کیسے کر سکتی ہوں۔ کچھ عرصہ پہلے ''لائف ٹائم'' میگزین نے میرے انٹرویو میں لکھا'' وہ خاتون حوالتفاقاً اپنے جیسی متاثرہ خواتین کی وکیل بن گئی۔'' یہ جملہ کافی حد تک میری زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔ میں جن خطوط پر کام کر رہی ہوں، اس کی جرأت شاید مجھ میں پیدا نہ ہو پاتی۔ لیکن ایسے لگتا ہے کہ کسی غیبی طاقت نے یہ ذمے داری میرے سپرد کر دی ہے۔ ابتداء میں مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں کیا کرنے جا رہی ہوں میں نے بس اتنا کیا کہ کہ جب مختلف رفاہی اور سماجی اداروں کی طرف سے مجھے دعوتیں ملنے لگیں کہ میں ان کے پلیٹ فارم پر آ کر کسی میٹنگ اور اجلاس وغیرہ میں اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے اور اس کے اثرات وغیرہ کے بارے میں بات کروں۔ تو میں نے قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ ان دعوتوں کو قبول کرنا شروع کر دیا۔

اس کا حیرت انگیز نتیجہ سامنے آیا۔ خواتین نے مجھے خطوط وغیرہ بھیجنے شروع

کر دیئے جس میں وہ بتاتیں کہ ان کے ساتھ بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا تھا، لیکن انہوں نے کسی کے سامنے زبان نہیں کھولی۔ کسی کو اس راز میں شریک نہیں کیا۔ پہلی بار انہوں نے مجھ سے جرأت سے کام لیتے ہوئے میرے ساتھ اس ضمن میں رابطہ کیا اور مجھے یہ بات بتائی مجھے اندازہ ہوا کہ اس سلسلے میں عورت کو ہی جرأت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کوئی اور اس سلسلے میں زبان کھولے تو دوسری متاثرہ عورتیں بھی اس کی آواز میں آواز ملانے میں کی ہمت کر لیتی ہیں ورنہ وہ ہونٹ سیئے بیٹھی رہتی ہیں۔ ان کی جرأت ان کے اندر ہی مقید رہتی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو شرم سار محسوس کرتی ہیں، جرم کسی اور نے کیا ہوتا ہے لیکن احساس جرم سے ان کا سر زندگی بھر جھکا رہتا ہے۔ ان میں اور مجھ میں فرق یہی تھا کہ میں نے زندگی بھر شرمسار رہنے سے انکار کر دیا۔۔۔ میں نے گویا سر اٹھا کر پوچھ لیا تھا کہ میرا کیا قصور ہے۔؟؟؟ میں کیوں شرمسار رہوں۔؟؟؟

''ایسی جرأت کا مظاہرہ امریکہ کی رہنے والی ''ڈیبی اسمتھ'' ہی کر سکتی تھی۔ اس جرأت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ڈیبی اسمتھ چار سال کی جدوجہد اور کاوش کے بعد قانون ساز افراد اور حکومتی نظام میں اثر ونفوذ رکھنے والے افراد کی توجہ اس اہم مسئلہ کی جانب مبذول کرانے میں کامیاب ہوگی۔ اس جدوجہد میں بہت سے اور لوگ بھی اس کے ساتھ تھے۔ ڈیبی اسمتھ نے قانون سازوں کی نظر میں اس مسئلے کی اہمیت کو اجاگر کیا اور انہیں احساس دلایا۔کہ زیادتی کا شکار ہونے والی کی عورت کی ضروریات کیا ہوتی ہیں اور اُسے کس کس نوعیت کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے اس طویل تپسیا کا نتیجہ ایک بل کی صورت میں ملا جسے ایوان نے

متفقہ طور پر منظور کیا۔''

اس بل کا غیر رسمی عنوان ''دی ڈیبی اسمتھ ایکٹ'' ہے لیکن باضابطہ طور پر اسے ''جسٹس فار آل ایکٹ آف 2004'' لکھا جاتا ہے۔

اس بل کے ذریعے تین خاص کام کرنے پر اصولی اتفاق کیا گیا تھا۔

۱۔ پہلی بات تو یہ طے کی گئی تھی کہ پورے امریکہ میں زیادتی کی شہادتوں کی کٹ ۔۔۔۔ جسے Rapekit کہا جاتا ہے۔اس کا ایک کم از کم معیار مقرر کیا جائے گا۔

۲۔ ریاستوں میں پہلے سے جمع شدہ Rapekit اور مجرموں کے ڈی۔ این۔اے کی پیکنگ کا کام نمٹانے کے لئے فنڈز فراہم کئے جائیں گے

۳۔ ان تمام افراد کی تربیت اور ان کی خدمات سے استفادہ کرنے کے لئے فنڈز فراہم کیے جائیں گے جو زیادتی کی شکار خواتین کی مدد کے سلسلہ میں سب سے پہلے آگے آئیں گے۔''

''مسز ڈیبی اسمتھ'' کا کہنا ہے ''گذشتہ چار سال کی جدوجہد کے دوران میں سب سے اہم بات میں نے یہ سیکھی کہ ایک آواز اگر دوسروں کی نمائندگی کرتے ہوئے مسلسل اصرار اور تواتر سے بلند ہوتی رہے تو آخر کار اس کا کچھ نہ کچھ اثر ہو ہی جاتا ہے۔حالات میں کچھ نہ کچھ تبدیلی آ ہی جاتی ہے۔ایک گھریلو عورت مسلسل اپنی صدا بلند کرتی رہی ۔۔۔۔۔اور آخر کار اس نے حکومتی لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا ہی لی۔

3 مارچ 1989 کو ڈیبی اسمتھ ایک متاثرہ عورت تھی۔جس کے ساتھ ایک جرم کا ارتکاب کیا گیا تھا۔جن عورتوں کے ساتھ یہ سانحہ پیش آتا ہے ان میں سے بیشتر زندہ رہتی

ہیں۔لیکن زندگی، زندگی میں بھی فرق ہوتا ہے۔بعض اس واقعے کا زخم اپنی روح پر لے کر بس محض زندہ ہی رہتی ہیں۔بعض گویا ایک نئی زندگی حاصل کر لیتی ہیں یا کم از کم اپنی مطمئن اور خوش وخرم زندگی کی طرف لوٹ آنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔

اب دنیا بھر میں ایسی متاثرہ خواتین میں اپنی زندگی کی خوشیوں پر اپنا حق جتانے کا شعور پیدا ہو رہا ہے۔ایک دوسرے کی آواز میں آواز ملانے کا جذبہ اور عوام کے سامنے اس موضوع پر بات کرنے کی جرأت بھی پیدا ہو رہی ہے۔ رودھو کر چپ ہو کر بیٹھ جانے ۔۔۔اپنے لب سی لینے ۔۔۔یا خود ہی ایک بے عنوان سی ملامت کو اپنے سر لے لینے کے رجحان میں کچھ کمی آ رہی ہے۔خود متاثرہ خواتین میں بھی یہ احساس جنم لے رہا ہے کہ یہ سانحہ تو کسی بھی عورت کے ساتھ کسی بھی وقت کسی بھی جگہ پیش آ سکتا۔شرمساری کے بوجھ تلے دب کر رہ جانا درحقیقت زیادتی کے مجرم سے مزید شکست کھانے کے مترادف ہے۔

اسی طرح کی ایک اور باہمت خاتون کا تذکرہ بھی میں کرنا چاہوں گی۔جس کا تعلق پاکستان سے ہے اور وہ اجتماعی آبروریزی کا شکار ہوئی۔سرائیکی خطے کے ایک انتہائی پسماندہ علاقے سے تعلق رکھنے والی اس بہادر خاتون نے نہ تو کنوئیں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کی اور نہ ہی مجرموں کی طرح منہ لپیٹ کر گھر میں محبوس ہو گئی۔اس نے ہر وہ در کھٹکھٹایا جہاں سے اسے انصاف کی توقع تھی۔مختلف فورم اور پلیٹ فارمز پر اس نے اس ظلم کی داستان سنائی جس کے نتیجہ میں وہ مجرم اپنے انجام تک پہنچے اور اس خاتون کی بہادری کے صلے میں اسے ملکی وغیر ملکی بہت سے اعزازات سے نوازا گیا۔آج وہ دنیا بھر میں لیکچر دیتی ہے۔اس پر ہونے والے جرم کے مضمرات کے بارے میں بتاتی ہے۔یہ مختاراں مائی ہے۔

''ظلم اور جرم پر خاموشی اختیار کر لینا بھی جرم اور ظلم ہے۔انصاف کا حصول اور جرم کی سزا اسی صورت میں ممکن ہے کہ اسے سامنے لایا جائے۔اس سلسلہ میں اب میڈیا کا رویہ بھی خاصہ مثبت ہے۔''

یہ تمام باتیں لکھنے اور اس کتاب کو منظر عام پر لانے کے پیش نظر بھی یہی جذبہ ہے کہ میرے دیس کی عورتیں جان سکیں کہ اُن کے حقوق کیا ہیں۔ وہ کیا کر سکتی ہیں۔ وہ اتنی کمزور اور بے بس نہیں ہیں جتنا کہ وہ سمجھتی ہیں یا انہیں بتایا جاتا ہے۔

کتاب کے اگلے صفحات میں میرے کچھ مضامین ہیں جن میں، میں نے اپنے طور کوشش کی ہے کہ عورتوں کے متعلق، ان کے حقوق کے بارے میں اپنے قارئین کو کچھ آگہی دوں۔ ہوسکتا ہے میری آواز کا گذر کچھ سماعتوں سے ہو۔۔۔۔ میری یہ مقدور بھر کوشش کسی کو شعور بخشے۔۔۔ ایک ننھا دیا، مہیب اندھیروں کا دامن چاک کر دیتا ہے۔ تبدیلیاں ادنیٰ کاوشوں کی کوکھ سے جنم لیتی ہیں۔ لہٰذا ہوسکتا میری یہ ادنیٰ سی کوشش بھی کسی مقام تک جا پہنچے۔۔۔

☆☆☆☆☆☆

میری زندگی

میرا تعلق ہندوستان میں یوپی کے ایک تعلقہ دار گھرانے سے ہے، میرے دادا پھر میرے تایا تعلقہ دار رہے، جبکہ میرے تایا کو زمینداری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں سیاسیات کے استاد تھے لہٰذا میرے والد کو زمینداری کے انتظام وانصراف ذمہ داری سونپ دی گی۔

آج میری سوچ کا جو انداز ہے اور زندگی کو گزارنے کا جو انداز ہے۔ اس کے پیچھے میرے والد کی تربیت کا بے حد اثر ہے۔

میں جب چھوٹی تھی اور سوچ بھی پختہ نہ تھی۔ اس وقت بھی میرے والد مجھے اپنے ہمراہ ادبی محافل، مشاعروں اور سیاسی اجتماعوں میں لے کر جاتے تھے۔ اُس دور میں میرے مشاہدے میں بہت سی چیزیں آئیں۔ لیکن جو چیز میرے دل میں گھر کر گئی۔ وہ یہ تھی کہ میرے والد تعلقہ در زمیندار تھے۔ زمینداری کے دامن سے لپٹے ہوئے جھگڑے ہوتے ہیں۔ دشمنی جنم لیتی ہیں تو چھوٹے زمیندار جھگڑے اور لڑائیوں کی منصفی کے لئے میرے والد کے پاس آتے تھے۔

وہاں میں نے دیکھا کہ میرے والد کے پاس جو جھگڑے بفرض تصفیہ آتے ان میں متعدد کیس خواتین کے حوالے سے بھی ہوتے تھے۔ خصوصاً ان خواتین کے جو اپنی مرضی سے کہیں شادی کر لیتیں تھیں یا اس کی خواہاں ہوتی تھیں۔ وہ خواتین تشدد کا نشانہ بنتی تھیں۔ نہ صرف ایک فریق بلکہ دونوں طرفین سے ان کی زندگی اجیرن کر دی جاتی تھی۔

کچھ ایسے کیسز بھی ہوتے تھے۔ جن کو شادی کے بعد طرح طرح کی زیادتیوں کا سامنا ہوتا تھا۔ خاوند ان کو مارتے پیٹتے، جانوروں سے بدتر سلوک روا رکھا جاتا اور ان عورتوں کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ ایسے کیسز میں میرے والد ان کا فیصلہ ایک روایتی جاگیردار کے انداز میں نہیں بلکہ لبرل سوچ کے ساتھ کرتے تھے۔ اور عورت، مرد کو یکساں جانتے ہوئے ان کیسوں کو حل کرتے۔ اگر چہ کچھ زمیداروں کو ان کا یہ رویۂ پسند نہیں آتا تھا کہ ان کے خیال میں عورت جانور سے بھی بدتر تھی۔

اردگرد کے بڑے زمیندار میرے والد کو کہا کرتے تھے۔ ''اس قسم کے لوگوں کو آپ کے انداز منصفی سے شہ ملتی ہے۔ خصوصا عورت تو ایک کم تر مخلوق ہے۔ اس کو مرد کی غلامی میں ہر صورت رہنا چاہئے۔''

مرد گھر کا سربراہ ہے۔ وہ اگر غلط بھی کہتا اور کرتا ہے تو گھر کی عورت کو اس کا فیصلہ ہر طور ماننا ہوگا۔ سرکشی کی صورت میں اگر وہ تشدد بھی کرتا ہے تو یہ اس کا حق ہے میں اس ناسمجھی کے دور میں سوچتی تھی، کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ اللہ جو ہر حال میں انصاف کرتا ہے وہ کیونکہ کسی انسان کو کمتر درجہ پر رکھے گا۔ اس انداز فِکر اور سوچ میں کہیں کچھ غلط ہے۔

میری پرورش ایسی لبرل سوچ کے زیر اثر ہوئی جس سوچ کے ساتھ میری اٹھان ہوئی وقت کے ساتھ وہ مزید توانا ہوتی گئی۔

میرے والد چوہدری محمد رفیع مسلم لیگ یوپی کے جوائنٹ سیکرٹری تھے۔ پھر جب لیاقت علی خان وزیر خزانہ بنے تو میرے والد ان کے آفس سیکرٹری بھی بنے، پھر ہم لوگ جب 1954ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ یہاں میری پڑھائی شروع ہوگئی۔ مدرستہ البنات سے میں نے میٹرک کیا اور پھر کالج کی پڑھائی شروع ہوگئی۔

اس وقت یہاں بھی، لاہور شہر میں بلکہ ہر جگہ مجھے عورت مظلوم نظر آئی۔ بلکہ اس دور میں کوئی عورت مجھے کسی فورم پر اپنے اور دیگر عورتوں کے کوئی آواز بھی اُٹھاتی نظر نہیں آتی۔ شاید ان کا یہی خیال تھا کہ ہم بھیڑ بکریاں ہیں۔ اور یہی ہمارا نصیب ہے۔ اور اللہ

کی طرف سے، اور سماج کی طرف سے بھی یہی ہمارا مقام ہے۔

یہ حالات، عورت کی مظلومیت اور سماج اور رشتوں سے ان کا خوف، میرے دل وذہن میں ایک انداز فکر کو پروان چڑھانے لگا اور میں نے طے کر لیا کہ مجھے عورتوں کے حقوق کی وہ جنگ لڑنا ہے، جس میں، میں شاید نہتی ہوں گی اور اکیلی بھی۔ لیکن بہر حال میں اکیلی تو نہیں رہی۔ روشن خیال لوگوں کا ساتھ مجھے میسر آتا چلا گیا۔ وہ لوگ جو میری سوچ کے ہی پرتو تھے۔ اسکول کے دنوں میں نے ریڈیو کا رُخ کیا۔

ریڈیو اس زمانے میں ایک بڑا میڈیا تھا۔ ریڈیو سے نکلنے والی آواز پورے پاکستان میں سنی جاتی تھی۔ میں نے ریڈیو جوائن تو اسکول کی طرف سے بچوں کے تعلیمی پروگرام سے کیا، لیکن جوں جوں میں بڑی ہوتی گئی۔ میری لگن اور قابلیت دیکھ کر دوسرے پروگراموں اور ڈرامہ میں صدا کاری کے مواقع بھی ملتے گئے۔ اس ضمن میں میرے والد نے میری مدد کی۔ انہوں نے نہ صرف ڈراموں میں صدا کاری کی اجازت دی بلکہ میری حوصلہ افزائی کی۔

ریڈیو کی صدا کاری میں ابتداء ہی سے مجھے بھی جناب اشفاق احمد کی رہنمائی نصیب ہوگئی۔ انہوں نے بکمال شفقت سے مجھے سکھایا کہ اس طرح سے آواز کے زیر و بم ہونے چاہیں۔ اس لیکن انداز سے فقرے کو تھروکرنا ہے۔

ان کی رہبری نے میری صدا کاری کو جِلا بخشی اس طرح سے وہ میرے رہبر اور اُستاد ٹھہرے۔ ان کی سکھائی ہوئی باتیں بعد میں ٹیلی ویژن پر بھی میرے کام آئیں۔

ٹیلی ویژن کی ابتداء کے پہلے دن ہی سے میں ٹیلی ویژن کے ڈرامہ میں حصہ لے رہی تھی۔ یہاں بھی میرے خضر راہ نما اشفاق احمد تھے۔ بانو قدسیہ کے ڈرامہ سے میری ٹیلی ویژن کی زندگی کا آغاز ہوا۔

اس دور میں بہت بڑے لکھاریوں کے ڈرامے نشر ہوتے تھے لیکن ان ڈراموں کو دیکھ کر یا پھر ان میں اداکاری کر کے مجھے یہی محسوس ہونا تھا کہ ادب سے لیکر ڈرامہ کی صنف

تک میں عورت کو ثانوی حیثیت حاصل ہے۔اس میں ڈرامہ نگار کا قصور نہیں تھا بلکہ یہ ہمارا معاشرتی المیہ تھا جس کا عکس ٹیلی ویژن پر دکھایا جاتا تھا۔

ٹیلی ویژن ڈراموں میں بھی مرد ہی مثبت اور مرکزی کردار ہوتا تھا۔عورت ایک فاضل پہیے کی حیثیت سے ہوتی تھی۔

جوں جوں میرا شعور پختہ اور سوچ گہری ہوتی چلی گئی میں نے این۔جی۔اوز کے ساتھ ملکر کام کیا۔اس میں سب سے پہلے یہی کام تھا کہ عورتوں کی سوچ کو تبدیل کیا جائے اور انہیں یہ شعور ملنا چاہیے کہ وہ کھونٹے سے بندھی گائے بکریاں نہیں ہیں۔ بلکہ اس معاشرے کی ایک فعال رکن ہیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ ملکی سیاست میں بتدیلیاں آتی چلی گئیں۔پھر 1977ء کا جب سیاہ مارشل لاء آیا تو وہ عورتوں کے لئے وحشتوں اور اذیتوں کا ایک دور تھا۔جس میں بنائے گئے قوانین عورت کی شخصی آزادی کو سلب کرنے والے تھے۔قانون شہادت اور حدود آڑینس جیسے قانون عورت کے لئے بے حد اذیت ناک تھے اس دور میں ایسے لگتا تھا کہ اسلام کے نام پر نافذ کردہ یہ قوانین عورتوں کو ختم کرنے کے لئے ہیں۔ان کی شخصیت، اعتماد اور انا کو بری طرح اسلام کے نام پر کچلا گیا برعکس اس کے کہ اسلام تو سب سے زیادہ پروگرسیو مذہب ہے۔اس میں تو عورتوں کے حقوق کی حفاظت کی گئی ہے۔

بلکہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے حقوق کی بہتر انداز میں تشریح کی گئی ہے۔

اس دور سے پہلے جب بھٹو صاحب کی حکومت تھی اس دور میں میرے کچھ تحفظات تھے خصوصاً ایسٹ پاکستان کے مسئلہ پر میں سوچتی تھی کہ بھٹو صاحب نے اس !..... میں بہت بُرا کردار ادا کیا ہے۔لہٰذا بھٹو سے میری نفرت کا سبب ملک کو دولخت کر دینے کی وجہ سے تھی۔

اُس زمانے میں اصغر خان اور ان کی جماعت تحریک استقلال کا بہت شہرہ تھا۔اور وجہ شہرت دبنگ لہجے میں بھٹو کو للکارنا اور ان کی پالیسیوں پر سخت تنقید کے باعث تھی۔لہٰذا میں اُس جماعت میں شامل ہوگئی، پھر میں نے دیکھا کہ اصغر خان بھی بہت پروگیسو سوچ رکھتے

ہیں۔

اسی دور میں میں نے این۔جی۔اوز کے پلیٹ فارم سے عورتوں کے لئے بہت کام کیا۔ اور اس کام میں شدت ''ضیاالحقی'' دور میں آگئی جب بچیوں سے بھی کہا گیا کہ اسکولوں میں چادریں لیکر آئیں۔ راہ چلتے جوڑوں سے نکاح نامے طلب کیے جاتے۔ عورتوں کو چادریں اوڑھنے کے لئے حکم جاری کیا گیا۔ اگر چہ لباس تو عورت کا ذاتی پسند یا ناپسند ہے اس میں مملکت کا کوئی حق نہیں کہ عورت کو کیا پہننا یا نہیں پہننا۔ وہ دور ''اسٹیٹ'' کے جبر کی خوفناک تصویر ہے۔

اس دور میں میری سوچ یہ تھی کہ عورت ہی کیوں سٹیٹ کے جبر کا شکار ہو رہی ہے ۔اُسی دور میں ویمن ایکشن فورم (WAF) نام سے ایک این۔جی۔او کا قیام عمل میں آیا۔ جو جلد ہی عورتوں کے لئے، ان کے حقوق کی پاسداری کے لیے ایک چھتری بن گئی۔ اور ہم نے اس آرگنائزیشن کے ذریعے عورتوں کو ان کے بارے میں آگاہی دی انہیں شعور اور ایک نیا اعتماد دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سب کچھ کرنے کے پیچھے بہت کرب بھی ہے۔ ہم لوگوں نے سڑکوں پر آواز حق بلند کرتے ہوئے پولیس کی ماریں، ٹھڈے کھائے، ہمیں سڑکوں پر گھسیٹا گیا۔ چادر، چار دیواری کا نعرہ بلند کرنے والی حکومت کے گماشتوں نے ہمارے سروں سے دوپٹے چھینے یہ سٹیٹ کا عجب دوغلا نہ پن اور منافقت تھی۔

آواز حق کو دبانے کے لئے کرفیو نافذ کر دیا جاتا تھا، جب کرفیو ختم ہوتا ہم پھر عورتوں کے لئے سڑکوں پر آجاتیں۔ پھر جب قانون شہادت کے نام پر ایک نیا قانون آیا۔ جب عورت کو ایک مرد کے مقابلے میں آدھی قرار دیا گیا۔ اس پر ہم نے بہت احتجاج کیا۔ جس کے نتیجے میں گرفتاریں ہوئیں، ہم پر تشدد ہوا۔ لیکن اس سارے عمل میں میری سوچ مزید پختہ ہوتی چلی گی۔ اُسی دور میں مجھے مختلف لوگوں سے ملنے کے مواقع ملے جس سے میری سوچ کے در وا ہوئے۔ میری فہم میں اور اضافہ ہوا۔

اسی دور میں مختلف ممالک کی آرگنائزیشن نے مجھے مدعو کیا۔ وہاں کے لوگوں سے

گفتگو کے سیشن ہوئے جس سے میری فکر میں اضافہ ہوا اور عمل میں مزید پختگی آتی چلی گئی۔

مجھے نیپال، فلپائن اور تھائی لینڈ میں مدعو کیا گیا جہاں مجھے پاکستانی عورتوں کے استحصال اور مسائل کو ہزاروں لوگوں کے سامنے بیان کرنے کا موقعہ ملا۔ نیروبی میں ہونے والی تیسری عالمی کانفرنس میں بھی مجھے شرکت کا موقعہ ملا۔ وہاں مختلف لوگوں کے خیالات سننے کے بعد میرے عزم میں اضافہ ہوا کہ عورتوں کے لئے کچھ کرنا چاہیے۔ انہیں آگاہی ہونی چاہیے۔ اپنے ان حقوق کے بارے میں جو انہیں آئین نے دیئے۔ ملکی قانون نے دیئے، انکے اپنے مذہب نے دیئے۔ اپنے حقوق کی جنگ عورتیں لڑتی رہیں اور ان پر کوئی سمجھوتہ نہ کریں۔ نیز وہ عورتیں جو بہرہ مند نہیں تھیں انہیں بھی یہ آگاہی، یہ شعور ان کے آس پاس کی عورتیں دیں اور یوں یہ کرن در کرن ایک نئی روشنی بن جائے۔

ہماری یہ جدوجہد ایک مسلسل عمل بن گئی۔ اگرچہ میں ایک سیاسی جماعت کی کارکن تھی، ہم نے دیگر سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں سے رابطہ کیا کہ وہ اپنے منشور میں عورتوں کے حقوق کے بارے میں وضاحت سے بیان کریں۔

سیاسی جماعتیں ایسا ذریعہ تھیں جن سے ہم عورتوں کے حقوق کے بارے میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو آگاہ کر سکتے تھے۔

ہماری اس جدوجہد، سعی مسلسل کا یہ نتیجہ نکلا کہ ہر سیاسی جماعت نے اپنے منشور میں عورتوں کے حقوق کی بات کی، خواہ ایک ہی جملے میں کہی۔ 1988ء کے انتخابات میں پہلی بار ہر جماعت نے عورتوں کی بات کی گرچہ اس سے کسی عورت کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہ آتی اس کی شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عورتوں کے حقوق کے لیے بات کرنا سیاسی جماعتوں کی منشا نہیں تھی۔

☆ جب 1988ء کے الیکشن ہوئے اس میں بھی بہت کم تعداد میں عورتیں اسمبلی میں آئیں لہٰذا قانون ساز اداروں میں عورتوں کے حقوق کے لئے کچھ نہ ہو سکا حتیٰ

کہ اسمبلی فورم پر بات بھی نہیں ہوتی تھی۔ جو جدوجہد ہم عورتوں کے لئے باہر کر رہے تھے ان کو اسمبلیوں میں نہیں لا سکے۔ لہٰذا عورتوں کے حقوق کے لیے قانون سازی ایک ناممکن عمل تھا۔

☆ میں جب یہ قوانین حدود آرڈیننس، دیت اور قصاص، اور قانون شہادت وغیرہ کے لئے کوششیں کر رہی تھی۔ تو میری یہ خواہش تھی کہ خواتین کو اسمبلیوں میں ہونا چاہئیے تا کہ وہ قانون سازی کے عمل میں باقاعدہ حصہ لیں۔ 1988ء میں عورتوں کی مخصوص نشستوں کو بھی ختم کر دیا گیا تھا۔

اگرچہ 1935ء سے قانون ساز اسمبلیوں میں خواتین کے لئے کوٹہ مختص کیا گیا تھا۔ 1965ء کے الیکشن میں بھی، حالانکہ وہ انتخابات بھی آمریت کے دور میں ہوئے تھے۔

1973ء کے آئین کے تحت بھی خواتین کو اسمبلیوں میں مخصوص نشستوں پر الیکشن میں حصہ لینے کی اجازت تھی لیکن یہ شق بھی موجود تھی کہ دس سال کے بعد خواتین کے لئے مخصوص نشستیں ختم ہو جائیں گی۔ لہٰذا 1988ء میں یہ نشستیں ختم ہو گئیں۔ یہ بے نظیر کا دور حکومت تھا۔ لیکن انہوں نے بھی تمام تر ترقی پسندانہ خیالات اور عورت ہونے کے ناتے سے بھی کوئی کوشش ان نشستوں کی بحالی کے لئے نہیں کی۔

چونکہ وہ مخصوص نشستیں جن کے ذریعے عورتیں قدرے آسانی سے اسمبلی میں آجاتی تھیں۔ لہٰذا اکا دکا عورتیں جنرل سیٹوں پر منتخب ہو کے آتی تھیں۔ یہ منتخب ہونے والی خواتین عورت ہونے کے ناتے سے نہیں بلکہ اپنی آبائی اور موروثی، محفوظ سیٹوں کے ذریعے اسمبلی میں آتی تھیں۔ لہٰذا ان کا ہونا یا نا ہونا کچھ معانی نہیں رکھتا تھا۔

نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو اس لئے منتخب ہو گئیں کہ وہ علی الترتیب بھٹو کی بیوی اور بیٹی تھیں۔ اسی طرح بیگم نسیم ولی خان اس لئے نشست جیتیں کہ وہ ولی خان کی بیوی تھیں۔ یا

پھر بیگم عابدہ حسین تھیں، یہ وہ خواتین تھیں جن کا حلقہ بنا ہوا تھا۔ اور خاندان کی وجہ سے ان کا ووٹ بنک تھا..... لیکن ان کی تعداد اتنی کم تھی جیسے آٹے میں نمک، لہٰذا قانون ساز نقار خانے میں ان کی آواز طوطی کی سی تھی۔

1997 کا جو الیکشن ہوا، اس میں اُس وقت کی سرکاری مسلم لیگ (ٹو، تھرڈ) دوتہائی کی اکثریت سے جیتی۔ نواز شریف صاحب اس مسلم لیگ کے صدر بھی تھے، اور پھر وزیراعظم بھی بنے۔

ہم لوگوں نے اس وقت ان سے مطالبہ کیا کہ آپ دوتہائی کی اکثریت سے اسمبلیوں میں بیٹھے ہیں آپ چاہیں تو صرف آپ کے اراکین اسمبلی میں بغیر کسی جماعت کی مدد سے خواتین کے لئیے مخصوص نشستوں کو بحال کر سکتے ہیں۔

میں نے اس سلسلے میں آواز بلند کی کہ قومی اسمبلی میں 20 خواتین کی نشستیں اور اسی تناسب سے صوبائی اسمبلیوں میں مختص سیٹیں بحال کی جائیں۔ لیکن نواز شریف صاحب کو عورتوں کے حقوق اور نشستوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ ان کی عورتوں سے دلچسپی صرف اس حد تک تھی کہ وہ ان کے لئے کام کریں اور ان کے ووٹ بنک میں اضافہ کریں۔

عورت کا اسمبلی میں آنا..... نہ تو ان کے منشور میں تھا اور نہ ہی ذہن میں۔ اس پر مستزاد کہ ان کے والد محترم جو ''ابّا میاں'' کہلاتے تھے، خواتین کے اسمبلی میں آنے کو سخت ناپسند کرتے تھے پھر سعادت مند بیٹا ان کے حکم سے روگردانی کیسے کر سکتا تھا۔ لہٰذا وہ نشستیں انہوں نے بحال نہیں کیں۔

یہاں میں ایک بات بتاتی چلوں کہ جب سنیٹر ملک قاسم کا انتقال ہوا تو ان کی خالی سیٹ پر بے نظیر بھٹو نے پنجاب کی خاتون صدر کو سیٹ کے لئے ٹکٹ دیا۔ ان کے پنجاب سے مقابلے کے لئے میاں اظہر اور کھوسہ صاحب وغیرہ نے کہا۔ پیپلز پارٹی کی اکثریت ہے وہ یقیناً الیکشن جیتیں گے۔ لیکن بلا مقابلہ منتخب ہونا بھی اچھی بات نہیں ہے۔ لہٰذا تم سینٹ کے الیکشن میں حصہ لو..... میں نے حامی بھر لی مگر جب شہباز شریف صاحب کو اس کا علم ہوا تو

انہوں نے کہا ''یہ کسی طور مناسب نہیں ہے۔کوئی عورت ہمارے پلیٹ فارم سے الیکشن میں حصہ لے پھر ہار جائے ،تو بڑی شرم کی بات ہے۔ میں نے ان سے عرض کی اس میں شرم کی بات کیا ہے بلکہ یہ تو ترقی پسند دانہ سوچ کی مظہر ہے۔ میں نے میاں صاحب سے مزید کہا ''آپ مجھے الیکشن لڑنے تو دیں۔ میں بھلے جیتوں یا ہاروں۔لیکن پارٹی کے لئے ایک اچھا عمل ہوگا کہ خواتین بھی اس جماعت میں یہ حق رکھتی ہیں کہ سینٹ کے لیے الیکشن میں حصہ لے سکتی ہیں۔ چنانچہ میں نے الیکشن میں حصہ لیا۔ چودھری شجاعت صاحب ،میاں اظہر صاحب اور کھوسہ صاحب نے میرے ساتھ بھر پور تعاون کیا۔ میں اگر چہ وہ الیکشن ایک خاتون کے مقابلے میں ہاری۔لیکن یہ تاریخ ہے کہ گر چہ میری پارٹی کے نمائندوں کی تعداد محض نوے تھی لیکن میں نے ایک سو اٹھارہ ووٹ حاصل کئے۔

نوے ووٹوں کے ہوتے ہوئے ایک سو اٹھارہ ووٹ ..... یہ میری جمہوریت اور خواتین کے حقوق کے لئے جدوجہد کیساتھ ساتھ اس بات کے عکاس تھے کہ اسمبلیوں میں بیٹھے ہوئے لوگ یہ چاہتے ہیں کہ خواتین قانون سازی کے عمل کا حصہ بنیں۔

میری جدوجہد اپنی جگہ، بھٹو دور کے چار دن کی اسیری کے علاوہ ضیاء الحق کے زمانے میں گرفتاریاں اپنی جگہ.....لیکن اٹھائیس زائد ووٹ جمہوری سوچ کا پرتو تھے۔ضیاء الحق کے زمانے میں تو میں تین بار مہینوں کے لئے اسیر رہی۔ بارہا یہ بھی ہوا کہ مجھے صبح گرفتار کیا گیا اور شام کو رہائی بھی مل گئی۔

اس دور میں بہت سی خواتین کیساتھ ساتھ میں نے بھی انسانی حقوق اور خصوصاً خواتین کے حقوق کے لئے آواز بلند کی۔ جب آواز بلند کرنے والوں کے تن سے سر بھی جدا کر دیئے جاتے تھے۔ انسانی تذلیل کا یہ عالم تھا کہ سر عام کوڑے لگائے جاتے تو مجمع کو سفروب کی سسکاریاں بھی لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے سنائی جائیں۔

2000ء میں جنرل مشرف نے NRB بنایا اور عورتوں کی نشستیں بحال کرنا چاہیں۔ این ۔آر۔ بی نے مختلف سیاسی جماعتوں ۔ این ۔جی ۔اوز اور سول سوسائٹی کی

خواتین کو اکٹھا کیا کہ بتائیں خواتین کی سیٹوں کی بحالی کے لئے کیا لائحہ عمل ترتیب دیا جائے۔

اس سلسلے میں، میں نے تین بار وہاں مسلم لیگ کی طرف سے نمائندگی کی۔ وہاں میں نے یہ مشورہ دیا کہ مرد حضرات جو قومی اسمبلی کے ممبران ہیں پہلے طریقہ کار کے مطابق وہ اپنے ووٹ کے ذریعے عورتوں کو ممبر اسمبلی بناتے ہیں، اس طریقہ کو ختم ہونا چاہئیے۔

اُن کی جگہ مناسب طریقہ انتخابات ''لسٹ سسٹم'' کو اپنائیں۔ پارٹیاں پہلے سے مخصوص نشستوں پر اپنی نامزد خواتین کی لسٹ الیکشن کمیشن کو دیں۔ جب وہ الیکشن جیت جائیں تو ووٹوں کے تناسب سے یہ نشستیں خواتین کو الاٹ کر دی جائیں۔

مجھے خوشی ہے کہ این آر۔ بی نے یہ میری تجویز قبول کر لی۔ لیکن ساتھ ہی افسوس اس بات کا بھی ہے کہ این آر۔ بی نے وہ بات نہیں مانی کہ 33 فی صد سیٹیں عورتوں کو ملنا چاہیں۔ انہوں نے خواتین کے لئے سترہ فی صد سیٹیں مختص کیں۔

بیجنگ میں ہونے والی چوتھی عالمی کانفرنس میں یہ ریزلیوشن پاس ہوا کہ دنیا بھر میں عورتوں کو قانون ساز اسمبلیوں میں کم از کم تنتیس فیصد نشستیں دی جائیں۔ اس ریزولیوشن کے پیچھے یہ سوچ کارفرما تھی کہ اگر خواتین کی نشستیں کم ہوں گی تو وہ کسی بھی قانون سازی کے عمل کا حصہ نہیں بن پائیں گی۔ یا پھر اس قانون کی مخالفت کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکیں گی خواہ وہ اسمبلی ہو۔ ادارے ہوں یا پھر جہاں بھی قانون سازی یا فیصلہ سازی ہوتی ہے عورتوں کو تیتیس فیصد کی نمائندگی دی جائے گی۔

اگرچہ اس وقت ہمارا 33% کا مطالبہ نہیں مانا گیا لیکن سترہ فیصد بھی لُو میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ثابت ہوا کہ ہمیں ساٹھ نشستیں ملتیں۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اتنی تعداد میں عورتیں نیشنل اسمبلی صوبائی اسمبلیوں اور سینٹ کی ممبر بنیں۔

اس دور میں ایک یہ اچھا کام ہوا کہ ڈسٹرکٹ گورنمنٹ، جو پوری دنیا میں تھی لیکن پاکستان میں اس کا تصور نہیں تھا۔ کہ نچلی سطح پر اختیارات ملیں۔ ڈسٹرکٹ گورنمنٹ میں خواتین کو 33% نمائندگی ملی۔ یونین کونسل، تحصیل اور ڈسٹرکٹ کونسل میں خواتین کو

33% نمائندگی مل گئی۔

یونین کونسل کی سطح پر خواتین ڈائریکٹ الیکشن جیت کر آئیں۔ جبکہ ڈسٹرکٹ اور تحصیل کونسل میں انہیں منتخب نمائندوں کو ووٹوں سے منتخب کیا گیا۔اس طرح سینٹ کی سیٹوں پر بھی سترہ فی صد نمائندگی دی گئی اور یہ پاکستان میں پہلی بار ہوا کہ خواتین قومی ،صوبائی اسمبلیوں اور سینٹ کے ساتھ ضلعی حکومتوں میں قانون سازی کے عمل میں شریک کار بنیں۔

2002ء کے انتخابات میں مسلم لیگ (ق) کے ٹکٹ پر میں بھی قومی اسمبلی کی ممبر بنی۔اس وقت میرے ذہن میں عورتوں کے حوالے سے جو باتیں تھیں۔ان کو میں نے اسمبلی میں بل اور ریزولیوشن کے ذریعے پیش کیا۔حقوق نسواں کے نام سے حدود آرڈیننس میں جو تبدیلیاں آئیں۔ان میں میرا بھی کسی حد تک حصہ تھا۔غیرت کے نام پر جو قتل کئے جاتے ہیں۔اس پر میرا ریزولیوشن آیا۔پھر اس پر قانون سازی بھی کی۔''ونی'' کہ اگر جرم مرد کرے تو اس کی سزا اس خاندان کی عورتوں کو ملے۔یہ ایک غیر اخلاقی ،غیر قانونی اور غیر آئینی فعل تھا۔اس کے خلاف اسمبلی میں قانون بنایا۔

میری خیال میں وہ عورتوں کے حقوق کے حوالے سے پاکستان کا بہترین دور تھا۔ پہلی بار عورتوں کے مسائل کو سنجیدگی سے لیا گیا۔اور مجھے بھی پہلی بار یہ موقع میسر آیا کہ میں خواتین کے لئے کام کرسکوں۔میں اگرچہ مخصوص سیٹ کے ذریعے اسمبلی کی ممبر بنی لیکن میں نے اپنے علاقے میں خواتین کے لیے کچھ کام کروائے۔لڑکیوں کے لئے ایک کالج اور دو ہائی اسکول بنوائے۔لڑکیوں کے لئے اسکول میں نے ایل۔ڈی۔اے سے منظور کروایا جبکہ لڑکوں کے اسکول کے لئے میں نے خود سے فنڈ مہیا کیا اور کچھ محکمہ تعلیم نے دیا۔اور مزید اس کیلئے فنڈ اسوقت کے وزیراعلیٰ نے مہیا کیا۔

''کھاڑک'' کا علاقہ جو قدرے پسماندہ ہے،میرے ہی حلقے میں ہے۔وہاں میں نے لڑکیوں کے لئے پولی ٹیکنک انسٹی ٹیوٹ بنوایا۔اپنی بساط کے مطابق جو میں کرسکتی تھی۔میں نے عورتوں کے لئے کیا۔ممبر اسمبلی کی حیثیت سے میں نے کچھ کام کیے

۔۔۔۔۔اب میں اسمبلی کا حصہ نہیں ہوں۔ مگر میری جدوجہد آج بھی جاری ہے۔ میرے خیال میں کسی بھی مثبت تبدیلی کے لئے میڈیا کا بھی اہم کردار ہے۔ اسی خیال کے پیش نظر میں نے عورتوں کے حوالے سے پرنٹ والیکٹرانک میڈیا کا سہارا لیا۔ میں نے عورتوں کے حوالے سے روزنامہ ''نوائے وقت'' میں آرٹیکلز لکھے۔ اس کے علاوہ روزنامہ ''جنگ'' اور ''خبریں'' میں بھی لکھا اور ''پاکستان'' اخبار میں بھی۔

اُردو اخبارات میں لکھنے کے علاوہ میں نے جہاں بھی تقاریر کیں انہیں ضابطہ تحریر میں لے آئی۔ ''میں جو سوچتی ہوں'' کہ عورتوں کو شعور اور آگاہی دینا چاہیے۔ یہ سوچ اور عمل اس کتاب کا محرک بنا۔

ہمیں ''قائداعظمؒ'' کے خیالات کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ کہ عورتوں کے بغیر کوئی جنگ جیتی نہیں جاسکتی۔ کوئی جدوجہد کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتی، کوئی انقلاب پایہ تکمیل نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن بدقسمتی سے جاگیردارانہ رویے اور قبائلی رسوم کی بنا پر ان خیالات کو کوئی عمل شکل دینے میں بہت سی دشواریاں حائل رہیں۔

لیکن اب آہستہ آہستہ لوگوں کے ذہنوں میں اس سوچ نے جنم لینا شروع کر دیا ہے کہ ''ترقی ان ہی ملکوں میں ممکن ہے جہاں عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں۔ ''معاشرے کا ہر فرد ترقی کا ضامن ہے۔

دنیا بھر کی آبادی کا نصف عورتیں ہیں.....کوئی بھی ملک نصف آبادی کو نظر انداز کر کے ترقی یافتہ نہیں بن سکتا۔

عورتوں کے حقوق کے لئے ابھی میری جدوجہد کا سفر رکا نہیں ہے۔ میری نظر میں ابھی بھی عورتوں کو وہ حقوق نہیں مل سکے۔ جن کی وہ حقدار ہیں۔

میرے خیال میں اس کی وجہ یہی ہے کہ سیاسی جماعتوں نے عورتوں کے حقوق کے بارے میں کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا۔ اور سیاستدانوں میں وہ ''وِل'' نہیں ہے کہ وہ عورتوں کے حقوق کا تحفظ کر سکیں۔

ہمارے سیاست دان محض اپنے ووٹ کی حد تک عورتوں کے حقوق کی بات کرتے ہیں۔ ہمارے لیڈر حضرات یہ دیکھتے ہیں کہ کسی جماعت کی بات پر عورتیں متوجہ ہوئیں ہیں تو وہ فوراً اسی طرح کی بات کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ باتیں محض انتخابات کے دنوں تک رہتی ہیں پھر بھولے بسرے خواب بن جاتی ہیں۔

پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ کئی بار اقتدار کے مزے لوٹ چکی ہے۔ لیکن انہوں نے بھی کبھی عورتوں کے حوالے سے کوئی کام نہیں کیا۔ بلکہ دلچسپ بات یہ ہے کہ نواز شریف کے دور اقتدار میں آٹھ مارچ جو خواتین کا عالمی دن ہے اس موقع پر جب ہم خواتین ''کسان ہال'' میں جمع ہوتیں تو ہمیں گرفتار کر لیا جاتا تھا۔

آج میں حیرت زدہ ہوں کہ یہی نواز شریف یہی ان کی جماعت اب خواتین کے لیے ''اسپیشل پیکج'' کی بات کرتے ہیں۔ اس پیکج کا آج کل بہت شہرہ ہے۔

اس کی وجہ میرے خیال میں صرف یہ ہے ''عمران خان'' جو ''قائداعظم'' کی سوچ لیکر سیاست میں داخل ہوا۔ ایک لبرل سوچ ..... کہ تمام انسانوں کے حقوق برابر ہیں۔ اسی کی فکر اور سوچ اور نظریے کو کاونٹر کرنے کے لئے '' خادم اعلیٰ'' یا پھر ''نواز شریف'' نے اس طرح کے کھوکھلے نعرے لگائے ہیں ان کے خیال میں نصف آبادی عورتیں اور ساٹھ فیصد نوجوان کہیں۔ ''تحریک انصاف'' کے ساتھ شامل نہ ہو جائیں۔ انہوں نے بھی اس طرح کے نعرے اور آواز بلند کرنی شروع کر دی ہے۔ میں یہ جانتی ہوں بلکہ عورتیں بھی اس سے باخوبی آگاہ ہیں کہ یہ صرف زبانی جمع خرچ ہے۔ اور ہم عورتوں کو اپنی جدوجہد جاری رکھنی چاہیے۔ خواہ میڈیا کے حوالے سے ہو یا پھر دیگر پلیٹ فارم پر۔

ہماری یہ جدوجہد اسوقت تک جاری رہے گی جب تک ہمیں وہ حقوق نہیں مل جاتے جو ہمیں ہمارے مذہب نے دیئے۔ ہمارے آئین اور قانون نے دیئے۔ ہم ان قوانین کی پاسداری کرتے ہیں جو ہمیں انسانیت نے دیے۔

کہ ہم عورتیں بھی انسان ہیں۔ ہمیں وہی حقوق چاہے جو انسان نے انسانوں کو دیئے۔

☆.....☆.....☆

''میں سوچتی ہوں''

''گذشتہ لگ بھگ چالیس برس سے میں خواتین کے مسائل کو
اُجاگر کرنے کی کوشش کرتی رہی ہوں۔''

ہمارے ملک اور دیگر غیر ترقی یافتہ ممالک میں عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق کے قابل نہیں سمجھا جاتا بلکہ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ انہیں سرے سے انسان ہی نہیں گردانا جاتا۔ایک کمتر، کم فہم، کمزور مخلوق جن کا کام صرف دوسروں کی خدمت کرنا ہے۔

اسلام عورتوں اور مردوں کے حقوق کو مساوی قرار دیتا ہے اور کہیں، کچھ معاملات میں عورتوں کے حقوق مردوں سے بڑھ کر ہیں۔اس کے برعکس ہمارا سماج اور ہماری سوچ عورت کو کم تر سمجھتی ہے۔گھر کا حاکم مرد کو سمجھا جاتا ہے جبکہ عورت کی حیثیت فقط ایک بے زبان لونڈی، باندی کی طرح ہے۔

یہ سوچ اور یہ فکر بنیادی طور پر قبائلی طرزِ معاشرت کی دین ہے۔اس طرز زندگی اور سوچ کو مذہب کے بنیادی اصولوں پر فوقیت حاصل ہے۔

جب کوئی عورت اس سوچ کے خلاف آواز بلند کرتی ہے تو اُسے ''مغرب زدہ عورت'' کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔اور کہا جاتا ''صنفِ نازک'' ہونے کے باوجود یہ مرد کی برابری کرتی ہے۔یا یہ کہ ''اس قسم کی عورتیں ''حقوق'' کے نام پر خاندانی نظام کو تباہ کر رہی ہیں اور معاشرے میں منفی جذبوں کو پروان چڑھا رہی ہیں۔

اس طرح کی باتیں سنتے ہوئے میری عمر گذر گئی۔

''اب میں سوچتی ہوں'' کیا پاکستان کو بنانے کے لئے عورتوں نے اس لئے جد ِجہد کی تھی۔؟

اگر ''قائداعظم ؒ'' نے پاکستان اسلام کے نام پر بنایا، تو پھر ان کی سوچ، فکر اور نظریہ وہی تھا۔ جو پیارے رسول عربی **صلی اللہ علیہ والہ وسلم** کا تھا۔

وہی نظریہ کہ اللہ کے نزدیک عورت اور مرد مساوی ہیں۔ عورتوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہیں جو مرد کو۔ سزا اور جزا عورتوں اور مردوں کے لیے یکساں ہیں۔

''قائداعظم محمد علی جناح'' نے اپنی بہن جنہیں ہم ''مادر ملت'' کہتے ہیں، کو ہر جگہ اپنے ساتھ رکھا۔ انہوں نے آزادی کی جنگ اپنے بھائی کے شانہ بشانہ لڑی، یہ نا صرف آزادی کی جنگ تھی بلکہ ایک پیغام تھا کہ:

''عورت کے بغیر نہ تو کسی قسم کی ترقی ہو سکتی ہے اور نہ ہی کوئی جنگ
عورت کی شمولیت کے بنا جیتی جا سکتی ہے''۔

خواہ وہ جنگ پاکستان بنانے کے لئے نظریاتی جنگ ہی نہ ہو۔ میرا یہ کتاب لکھنے کا مقصد فقط اتنا ہے کہ میں عورتوں کو یہ آگاہی دے دوں کہ ''سوچو!'' تم کیا ہو۔

تم معاشرے کا ایک فعال حصہ ہو۔ اس کے باوجود سماج تمہیں مساوی حقوق دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔

اخلاقیات سے معاشیات تک۔ تربیت سے تعلیم تک کے عمل میں تمہارا ہی دخل ہے۔

اس کے باوجود ہمارے ملک میں تمہاری حیثیت سے معاشرہ انکاری ہے۔

"بول کہ لب آزاد، ھیں تیرے"

☆☆☆☆☆

پاکستان کی آبادی، "ایک لمحہ فکریہ"

کسی بھی ملک کے باسیوں کے اقتصادی حالت اس ملک کی خوشحالی جانچنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

اگر کسی ملک میں رہنے والوں کو صحت، تعلیم اور دیگر بنیادی سہولتیں حاصل ہیں۔ اور اس ملک کے وسائل اور آبادی میں توازن ہے تو وہ خوشحال ملک ہے۔

اگر کسی ملک کی آبادی میں وہاں کے وسائل سے بڑھ کر ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ عوام بہتر، خوشحال اور صاف ستھری زندگی گزار سکتے ہیں۔ گویا آبادی کے بڑھنے کا تناسب ملک کی خوشحالی کی ضمانت ہے۔

وسائل سے زیادہ بڑھتی آبادی ترقی کی شرح کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ تیزی سے بڑھتی آبادی وسائل کی کمی، مسائل کے اضافہ کے سبب ہیں۔

اگر عوام بنیادی سہولیات سے محروم رہیں تو یقیناً یہ محرومی اور وسائل کی عدم دستیابی غربت اور بے روزگاری کو جنم دیتے ہیں۔ اور پھر غربت اور بے روزگاری جرائم میں اضافہ کا سبب ٹھہرتے ہیں۔

اب ذرا ایک نظر پاکستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کی طرف ڈالیئے۔ پاکستان جو

ایک ترقی پذیر ملک ہے۔ 1961 میں اس کی آبادی فقط اکتیس ملین تھی، جو کہ 3 فی صد کی شرح سے بڑھتی ہوئی 2001 میں 144 ملین تک جا پہنچی اور اب 2012 میں اٹھارہ کروڑ سے تجاوز کر چکی ہے۔ اگر آبادی میں اضافہ کی صورتحال یہی رہی ۔ تو 2020 میں 220 ملین تک جا پہنچے گی۔

پاکستان آبادی کے لحاظ سے دنیا کا چھٹا ملک ہے۔اور اس کی آبادی میں سالانہ 206 فیصد کی شرح سے تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے جو کہ انتہائی خطرناک صورتحال ہے وسائل کی ترقی کے حوالے سے دنیا کے 182 ممالک میں پاکستان کا ایک سو اکتسیو اں نمبر ہے۔

کم تر وسائل اور ''بے تحاشہ'' آبادی.....یہی وجہ ہے کہ ملک میں پچاس ملین سے زائد افراد غربت کی سطح سے نیچے زندگی گذار رہے ہیں۔

چونسٹھ فیصد کو پینے کے لیے، صاف پانی، میسر نہیں ہے۔اٹھاسی ملین لوگوں کو صحت اور صفائی کی سہولیات میسر نہیں ۔ چھیاسٹھ ملین سے زائد افراد اپنے خاندان کے ہمراہ ایک کمرے کے گھر میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

گزشتہ پانچ برسوں میں بے روزگاری کی شرح میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ بے روزگاری اور غربت سے بچے اور عورتیں زیادہ متاثر ہوتی ہیں۔

بچوں اور خواتین کی ایک بڑی تعداد بنیادی ضروریات زندگی سے محروم ہے اس کے نتیجہ میں نوزائیدہ بچوں کی شرح اموات میں خطرناک حد تک اضافہ ہو رہا ہے۔

پاکستان میں تیزی سے بڑھتی آبادی، ماحولیاتی آلودگی اور قدرتی وسائل کی کمی میں اضافے کا سبب بن رہی ہے۔

اگر بڑھتی ہوئی آبادی کے بنیادی محرکات کا جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ خواتین میں جہالت اور عدم آگاہی اس کی بڑی وجوہات ہیں۔

آبادی میں اضافے کو روکنے کے لئے کچھ ضروری اقدامات کی از حد ضرورت

ہے۔ جن میں لڑکیوں کی تعلیم پر توجہ کی خاص ضرورت ہے۔ نیز عورتوں کو نہ صرف ''فیملی پلاننگ'' کی افادیت کے بارے میں شعور دیا جائے۔ بلکہ عورت کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ کتنے بچے پیدا کرنا چاہتی ہے۔ اسے اپنے جسم پر اختیار اور حق حاصل ہونا چاہئے۔ ہماری نوجوان نسل فہم وفراست سے کوسوں دور ہے۔ ان کے لئے ایسے پروگرامز تشکیل دیئے جائیں جن سے انہیں چھوٹے خاندان کی افادیت کا اندازہ ہو سکے۔ (ری پروڈیکٹو ہیلتھ کیئر)(Re Prodective Health Care) کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کی جائیں۔ بلکہ انہیں نصاب کا ایک حصہ بنایا جائے۔

ان پروگرامز کو ''قائداعظمؒ'' اور ''ڈاکٹر علامہ اقبالؒ'' کے ''تصورِ پاکستان'' سے ہم آہنگ کیا جائے اور نوجوان نسل کو بتایا جائے کہ ان عظیم رہنماؤں نے مملکت خداداد پاکستان کو صرف امیروں کے لئے ہی نہیں بنایا۔ بلکہ ہر شہری کا یکساں حق ہے۔

غربت کا خاتمہ اور کمی چھوٹے خاندان سے ہی ممکن ہے۔ کم بچوں کی تعلیم، تربیت اور پرورش آسانی سے اور صحیح خطوط پر ہو سکتی ہے۔

ہماری سیاسی جماعتوں کو بھی چاہئیے کہ ایسے پروگرام کو اپنے منشور کا حصہ بنائیں۔ اور تمام جماعتیں آبادی میں کمی کے لئے اپنی تمام تر کاوشیں بروئے کار لائیں۔

ان بنیادی عوامل پر عمل سے ہی ہمارا ملک ایک ترقی یافتہ اور خوشحال ملک بن سکتا ہے۔ وہ ملک جہاں ہر بچے کو تعلیم ملے۔ پینے کو صاف پانی، رہنے کو گھر تمام تر آسائشیں..... یہ مشکل ہے۔ ناممکن نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆

عورتوں پر تشدد

''تشدد سے مراد طاقت کا وہ ناجائز استعمال ہے جس میں جوش، سختی اور ہتک شامل ہو۔''

تشدد وہ عمل ہے، جس میں ذہنی جسمانی، جنسی اور جذباتی اذیت دی جائے۔ قتل، مار پیٹ، زندہ جلا دینا، آبروریزی، اجتماعی عصمت دری، تیزاب سے جھلسا دینا۔ غیرت کے نام پر ہونے والے قتل۔ عورتوں کو سر بازار بے عزت کرنا، عورت کی تجارت اور ان سے عصمت فروشی جیسا قبیحہ فعل کروانا۔ ذہنی اذیت دینا۔ زبردستی عورت سے شادی کرنا یا کرنے پر مجبور کرنا۔ تعلم اور صحت کی بنیادی سہولیات سے محروم رکھنا، غرضیکہ بے شمار افعال ہیں جو تشدد کے زمرے میں آتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں بے شمار عورتیں جو ہر کلاس اور طبقہ سے تعلق رکھتی تھیں تشدد کا نشانہ بنتی رہی ہیں۔

پچھلے کچھ عرصہ سے تشدد کے ان واقعات میں تشویش ناک اضافہ ہوا ہے۔ اس اضافے کی مختلف وجوہات ہوسکتی ہیں۔ مثلاً قانون کا جھکاؤ مرد کی طرف ہونا۔ سماجی دباؤ کے ذریعے عورتوں کی آواز کو دبا دینا۔ مذہب کے نام پر انہیں ڈرا دینا۔ عورتوں کی قانون اور

اپنے حقوق سے لاعملی ۔ مجموعی طور پر تشدد شکار ہونے والی خواتین کے متعلق معاشرے اور ریاستی اداروں کا غیر ہمدردانہ رویہ بھی شامل ہے۔

قیام پاکستان کے چونسٹھ برس بعد بھی ہم جاگیردارنہ ذہنیت، قبائلی رسم ورواج، انتہاپسندانہ مذہبی سوچ اور فرسودہ روایات سے چمٹے ہوئے ہیں۔

ان عفریت سے چھٹکارے کے لئے ہمیں نئے فکری انقلاب کی ضرورت ہے۔ عورتوں پر تشدد ان کے جینے کی راہ میں رکاوٹ اور ان کی آزادانہ نقل وحرکت کی آزادی کو سلب کرنے کی ایک کاوش ہے جو بنیادی انسانی حقوق سے متصادم ہے۔

تشدد سے ذہنی، روحانی اذیت جنم لیتی ہے اور یہ انسانی زندگی کی قدر اور وقار کے بھی منافی ہے۔

آئین پاکستان کی شق نمبر **34** کہ عورت کو قومی زندگی میں پوری طرح شمولیت کا حق ہے۔اس پر بھی یہ عمل اثر انداز ہوتا ہے۔

پاکستان کا آئین پاکستان کے تمام شہریوں کو بلاتخصیں مذہب اور جنس بنیادی انسانی حقوق اور قومی زندگی کے تمام مواقع یکساں طور پر فراہم کرنے کی ضمانت دیتا ہے۔ اس کی صورت حال کا اندازہ اقتصادیات کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق کرنے والے ممتاز عالمی ادارے ''اکنامک فورم'' کی رپورٹ ''گلوبل جینڈر گیلپ 2010'' سے بخوبی ہوسکتا ہے۔ ادارے کی رپورٹ کے مطابق پاکستان مرد وزن کو حاصل مواقعوں اور مراعات کی درجہ بندی میں ایک سو چونتیس ممالک میں سے ایک سو بتسویں نمبر پر ہے۔

اگر ہم مختلف شعبہ ہائے زندگی کا تقابلی جائزہ لیں تو پاکستان ''لیبر فورس'' میں خواتین کی شمولیت کے حوالے سے ایک سو چونتیسویں نمبر ہے۔

جبکہ مردوں کے مقابلہ میں عورت کو ملنے والی اجرت کے حوالے سے ایک سو بتیسوں نمبر ہے۔مرد کے مقابلے میں عورت کا کم تعداد میں عملی زندگی اور ترقی میں شرکت کا سبب یہ ہیں۔

i- مرد کے مقابلے میں عورت سے ترجیحی سلوک۔

ii- ملازمت کے دوران عورت کو جنسی طور پر ہراساں کرنا۔

iii- گھر کے باہر کا خوف وہراس، سرعام بے حرمتی ، دشمن داری میں، عورتوں کو انتقام کا نشانہ بنانا۔ اس کریہہ اور قبیح فعل کو معیوب یا غلط بھی نہیں سمجھا جاتا، کیونکہ دیہاتی پس منظر میں اس کو تشدد تسلیم نہیں جاتا۔ اس لئے اس کا ذکر تک بھی نہیں ہوتا۔

ہمارے معاشرتی ڈھانچہ جن روایات اور طریقہ کار سے مربوط ہے اس میں عورتوں پر کئی طریقوں سے تشدد ہوتا ہے۔ مثلاً زنا بالجبر، رسم ورواج کا سہارا لیکر عورتوں کا کاروکاری اور سیاہ کاری کے نام پر قتل کرنا۔ عورتوں کی تجارت، زبردستی عصمت فروشی پر مجبور کرنا، ملازم خواتین کو جنسی طور پر ہراساں کرنا۔ وغیرہ وغیرہ۔

قانون ہونے کے باوجود عمل درآمد نہ ہونے کی وجہ سے مجرموں کو سزا نہیں ملتی۔ 2002 اور پھر اس کے بعد کچھ قوانین بنے ہیں۔ لیکن قانون سازی کا فائدہ تب تک نہیں جب اس پر عملدرآمد نہ کروایا جاسکے۔ قوانین پر عملدرآمد سماج کی سوچ سے مشروط ہے۔ جب تک سماجی سوچ میں تبدیلی نہیں آئے گی کچھ نہیں ہو سکے گا۔

پاکستان کی ترقی کے لئے ایک تشدد سے پاک معاشرے کی ضرورت ہے۔ ہمیں معاشرتی بیداری کی مہم چلانا ہوگئی۔

''سوشل جسٹس'' کے بغیر عورت پر تشدد بند نہیں ہوسکتا۔ قانون ساز اداروں، پولیس ٹریننگ سنٹرز اور کالجز کے نصاب میں ''ویمن رائٹس'' کو شامل کرنا ہوگا۔ علاوہ ازیں سوشل ویلفیئر کے اداروں کو عورتوں کے تحفظ کے حوالے سے مکمل آگاہی دینا ہوگی۔

پولیس اسٹیشنز خصوصاً دیہی علاقوں کے تھانوں میں ''ویمن سنٹرز'' ہونے چاہیں جو گھریلو عورتوں پر تشدد کو مانیٹر کریں اور ''سوموٹو'' ان کو تحفظ دیں۔

یہاں میں ایک بار پھر یہ لکھنا چاہوں گی جب سیاسی جماعتوں کے منشور میں عورتوں کے تحفظات کے بارے میں مثبت اندازِ فکر نہیں ہوگا۔ جب تک ان کے منشور میں عورتوں کو برابری کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ اس وقت حالات میں تبدیلی ممکن نہیں ہے۔

بین القوامی ایجنسیوں کے دباو کی وجہ سے دکھاوے کے قوانین بنا کر خوش نہیں ہوں بلکہ عورت کو بھی انسان گردانتے ہوئے سنجیدگی سے ان قوانین پر عملدرآمد کروائیں۔

سماج کی آنکھیں کھولنے کے لئے ایک سروے رپورٹ کافی ہوگی، جس کے مطابق ..... 2008ء سے 2011 تک 32658 خواتین براہِ راست تشدد سے متاثر ہوئی ہیں۔

عورت پر تشدد فقط عورت کو ہی متاثر نہیں کر رہا ہوتا۔ بلکہ ہم ایک پر تشدد معاشرے کی تشکیل کر رہے ہوتے ہیں۔

عورتوں پر تشدد کی حوصلہ شکنی کے لئے ہمیں اپنے کچھ قوانین میں ترامیم اور کچھ نئے قوانین بنانا ہوں گے۔

جرگہ سسٹم اور پنچائیت سسٹم کا خاتمہ از حد ضروری ہے۔ جو اِن ''پنچائیتوں اور جرگوں'' کے غیر اخلاقی قوانین کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ خود سزا کے مستحق ہیں۔ یہ قانون ساز بیٹھکیں بنیادی طور پر انسانی تذلیل خصوصا خواتین کے لئے وڈیروازم اور جاگیرداری کی کوکھ سے ناجائز جنم کی حامل ہیں۔

☆☆☆☆☆

قانون اور عورت

پسماندہ اور کم تعلیم یافتہ ملکوں کا معاشرتی نظام بہت سے رُسوم اور رواجوں کے بندھن میں جکڑا ہوا ہوتا ہے۔ اور یہ رسم ورواج صدیوں سے انسان کو مکڑی کے جالے کی طرح اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہیں ہمارے ملک میں بھی رسوم ورواج کے نام پر خوفناک عفریت منہ پھیلائے بیٹھے ہیں۔ اور یہ رسوم یہ رواج غیر اسلامی اور غیر اخلاقی ہیں ۔ یہ دراصل ایک خاص دور کی پیداوار اور ایک مخصوص ذہنیت اور سوچ سے وجود میں آئے ہیں۔

لیکن اب جب دنیا ایک گلوبل ویلج کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ صنعت، سائنس، طب اور علم ادب کے لئے یہ ایک سنہرا دور ہے۔ انسانی شعور کی ترقی نے ''انسانی برابری'' کا تصور دیا۔ یہ تصور اب اتنا پختہ ہو چکا کہ کوئی کھلم کھلا اس کی مخالفت نہیں کر پاتا۔

جہاں بھی اور جب بھی کبھی آمرانہ سوچ کے حامل حکمرانوں نے اس تصور کو پامال کرنے کی کوشش کی ۔ وہاں عوامی اور گروہی تحریکوں نے حکومتوں سے مساوات کا اصول منوا کر چھوڑا۔

ہمارا وطن پاکستان برصغیر کے نہایت روشن خیال اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کی تخلیق اور تصور کا شہکار ہے۔ یہاں وہ قوانین نافذ کئے گئے تھے جو جدید معاشرے کے ہم آہنگ

خواتین کے حقوق کے محافظ تھے۔اور آج بھی ہیں۔

لیکن یہاں یہ لمحہ فکریہ اور سوچ جنم لیتی ہے کہ آیا خواتین ان قوانین کے بارے میں جانتی ہیں؟ کیا وہ فرسودہ رسموں اور جائز قانونی حقوق میں فرق تلاش کرسکتی ہیں؟ کیا وہ یہ اعتماد محسوس کرتی ہیں کہ اگر وہ اپنے جائز حق کے لئے آواز بلند کریں تو قانون ان کا ساتھی ہوگا۔؟

''میرا یہ لکھنے کا مقصد فقط اتنا ہے کہ خواتین اگر یہ آگاہی اور شعور رکھتی ہوں تو وہ صدیوں کے ظالم سفاک اور بہیمانہ رسم رواج کی زنگ خوردہ زنجیروں کو توڑ کر اپنا انسانی اور قانونی حق استعمال کرتے ہوراست قدم اُٹھا سکتی ہیں''۔

میں نے اپنی سیاسی اور انسانی حقوق کی جدوجہد میں بہت سی خواتین کو بعض ایسے مسائل پر قانونی اقدام کرنے کا مشورہ دیا۔جن کے لئے بظاہر کوئی قانون موجود نہیں تھا۔

ماہر وکلاء سے مشاورت کے بعد ہم نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ خواتین کے خلاف کچھ جرائم بعض قوانین کی گرفت میں آسکتے ہیں۔لیکن اس کے لئے خواتین کو از خود پہل کرنا ہوگی۔

کسی بھی ریاست کے قوانین اعلیٰ انسانی شعور اور ارفع اقدار کے عکاس ہوتے ہیں۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ گذشتہ چند عشروں میں پاکستان پر طائع آزما رجعت پرستوں کا غلبہ رہا ہے۔جنہوں نے پاکستان کو پسماندگی کی دلدل میں پھینک دیا ہے۔مظلوم اور کمزور طبقوں کو دیئے ہوئے حقوق چھین لئے ہیں۔آج کے پاکستان کی صورتحال قدرے روشن ہے۔تمام باشعور قوتیں اس رجعت پرستی کا جم کر مقابلہ کر رہی ہیں۔اور ان ظالمانہ قوانین کو ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہیں جو آرڈی نینسوں کی شکل میں خواتین کی تذلیل کا باعث ہیں۔

☆☆☆☆☆

خواتین کے آئینی حقوق

1- تعلیم کا حق

16 تا 18 برس کی ہر لڑکی کو، دیگر پاکستانی مردوں کی طرح تعلیم حاصل کرنے کا مکمل حق حاصل ہے۔ ہر وہ شخص جو جبراً لڑکی / عورت کو تعلیم کے حق سے محروم کرتا ہے۔ وہ آئین پاکستان کے آرٹیکل 25 کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ علاوہ ازیں وہ آئین کے حکمت عملی کے اصول 34 کی بھی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ اور عدالت سے سزا کا مستحق قرار دیا جا سکتا ہے۔

2- گھر سے باہر نکلنے کا حق:

یہ بہت ہی عام ہے کہ عورتوں پر گھر سے باہر نکلنے کی پابندی لگائی جاتی ہے۔ قانوناً ایسا حق کسی کو حاصل نہیں ہے۔ ایک عاقلہ و بالغہ عورت کے گھر سے باہر نکلنے پر پابندی لگانے والا فرد / افراد آئین پاکستان میں بنیادی حقوق 9 حکمت عملی کے اصول 34 اور بنیادی حقوق 15 کی خلاف ورزی کے مرتکب ہیں۔ جو کہ آئین پاکستان سے سنگین غداری ہے۔

3- کرائے کے مکان کا حق:

یہ ہمارے معاشرے میں عام بات ہے کہ مالک مکان، کسی عورت کو مکان کرائے پر نہیں دیتا۔ یہ انتہائی غیر قانونی رویہ ہے۔ ایسا کرنے والا شخص آئین کے آرٹیکل 25 کی نفی

کر رہا ہے۔ بلکہ آئین میں دیئے گئے بنیادی حقوق 15 کے آخری حصہ آباد ہونے کا حق، کی سنگین خلاف ورزی کر رہا ہے۔اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جاسکتی ہے۔

4-بدتمیز مردوں سے بچاؤ کا حق

عورتوں کو سب سے زیادہ ذہنی اذیت ان مردوں سے سہنی پڑتی ہے۔ جوان پر آوازے کستے۔

ان کا تعاقب کرتے ہیں، اور دوسری بدتمیزیاں کرتے ہیں۔ یہ تعزیرات پاکستان دفعہ 354 کے تحت سزا کے مستحق ہیں۔اور ان کے خلاف قانونی کاروائی کی جاسکتی ہے۔

☆☆☆☆☆

عورتوں کی ذہنی ترقی میں قلم کار خواتین کا کردار

عورت کو بہت ابتداء سے ہی یہ باور کرایا جاتا ہے کہ وہ صنفِ نازک ہے۔ مرد کو عورت پر ذہنی وجسمانی برتری حاصل ہے ..... ''عورت مرد جتنی ذہین نہیں ہوتی'' ''عورت مرد کے مقابلے میں ایک کمزور مخلوق ہے'' ..... مرد جو کام کر سکتا ہے وہ عورت کے بس کی بات نہیں ہے۔'' وغیرہ وغیرہ۔۔۔

اس طرح کے جملے اور کلمات سے ہمیں اکثر واسطہ رہتا ہے..... حتیٰ کچھ ''پڑھے لکھے جاہل'' تو یہاں تک کہہ جاتے ہیں۔ کہ اگر عورت کم تر مخلوق نہ ہوتی تو خدا تعالیٰ عورت کو بھی نبی ہونے کا مرتبہ ومقام ضرور عطا کرتا..... یہ کتنی احمقانہ بات ہے اور میں نے اس بات پر کئی دانشواروں کو تائید میں سر ہلاتے دیکھا ہے۔

عورت نبی کے درجے پر کیوں فائز نہیں ہوئی۔ اس کی دیگر مختلف وجوہات ہیں اور یہ ایک الگ بحث ہے جس کو پھر کسی وقت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔۔۔

میرے اس مضمون کا موضوع وہ خواتین ہیں جنہوں نے ادب کے میدان میں اپنے فن، ہنر اور قلم سے جھنڈے گاڑھے۔ عورتوں کی ذہنی نشو ونما اور ذہنی بالیدگی میں ان کے کردار کو نظر انداز یا فراموش نہیں کر سکتے۔

اگر میں کہوں کہ اُردو زبان کی ترویج وترقی میں کسی حد تک خواتین کا دخل رہا ہے۔

مگر کچھ لوگ اسے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔۔۔۔

اُردو زبان جب اپنے ابتداء میں ارتقائی عمل سے گذر رہی تھی ۔ اس وقت بھی خواتین نے اس زبان میں شاعری بھی کی اور کئی نثر پارے بھی تخلیق کئے۔۔۔ یہ عجیب ستم رہا ہے کہ عورتوں کو بسا اوقات فرضی مردانہ ناموں سے لکھنا پڑا جب کہ کئی نامور ادیبوں اور شاعروں کو اپنی تخلیقات عورتوں کے فرضی ناموں سے چھپوانی پڑیں۔

مردوں کے اس معاشرے میں اس بات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عرصہ دراز تک روشن خیال ترقی پسند، ادباء شعَرا اور نقاد عورتوں کی تخلیقات کو ''اُردو ادب کے زنانہ ڈبے'' سے تعبیر کرتے تھے..... گویا ان کی تحریریں اس قابل نہیں تھیں کہ وہ مردوں کی شاعری یا نثر نگاری کا مقابلہ کر پائیں..... عورتوں کی تحریروں کی ناپ تول، جانچ پڑتال ایک نقاد جنس سے مبرا ہو کر نہیں کرتا تھا۔ بلکہ یہ سمجھ کر کرتا تھا کہ اگر چہ یہ تحریر مرد ادیب کے پائے کی تو نہیں ہے لیکن اس میں یہ ہے..... اور اس کے بعد اس کی اچھائی برائی کے بارے میں بہت سی باتیں لکھتا۔ مگر افسوس کا پہلو یہ ہے کہ اس تحریر کی جانچ ایک خاص رویے اور سوچ کی ''عینک'' سے کی جاتی۔۔۔

یہ المیہ صرف قلم سے وابستہ خواتین کا ہی نہیں ہے بلکہ ''میل شاونسٹ'' سوسائٹی میں ہر عورت کو اس طرح کے رویے اور سوچ سے واسطہ پڑتا ہے۔

یہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ خواتین نے علم وادب کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے..... شاعری اور نثر میں ان کی تخلیق کردہ شہ پارے کسی طور بھی کم یا غیر معیاری نہیں ہیں۔ بلکہ اس میدان میں انہیں وہ شہرت، پسندیدگی اور مقبولیت ملی کہ شاید ہی کم مردوں کو نصیب ہوئی ہے۔

ان ہی تخلیق کار خواتین کا یہ فیض ہے کہ نقاد بھی اُردو ادب کے ''زنانہ ڈبے'' کو ادبی ریل سے الگ کرنے پر مجبور ہو گئے اور انہوں نے خواتین کو بھی مردوں جیسی ہی ادیبہ اور شاعرہ کا درجہ دیا۔

ان خواتین کی یہ بہت بڑی کنٹری بیوشن رہی ہے کہ انہوں نے نہ صرف اپنے آپ کو منوایا بلکہ پاکستان کی عورت کی صحیح نمائندہ کی صورت میں سامنے آئیں، نیز ان کی تحریروں نے عورتوں کو ایک آگہی اور شعور بھی دیا۔ عورتوں کے دکھ، مسائل، کرب کو سامنے لائیں عورتوں میں ان نثر پاروں کی وجہ سے پڑھنے کے رجحان میں بھی اضافہ ہوا۔

قراۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مستور، زاہدہ حنا، سارا شگفتہ، کشور ناہید، پروین شاکر عورتوں کے اس قبائل سے تعلق رکھتی ہیں، جنہوں نے زندگی کے اہم مسائل، کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا۔ اور ان کی تحریریں مردوں کی تحریروں سے کسی طور کم نہیں ہیں۔ بلکہ اہم بات یہ ہے کہ وہ ان موضوعات اور مسائل کو احاطہ تحریر میں لائیں جو اس سے پہلے دائرہ تحریر میں نہیں آسکے۔

اگر چہ کہا جاسکتا ہے کہ عورتوں کی گھریلو تربیت کے لئے پہلا ناول ''بنات النعش'' ڈپٹی نذیر احمد نے لکھا لیکن وہ ناول ایک محدود حلقے میں پند ونصائح پر مبنی تھا۔ عبدالحیم شرر نے بھی خواتین کے موضوعات کو چھیڑا..... مرزا ہادی رسوا نے ''اُمراؤ جان ادا'' نامی ناول میں ایک طوائف کی کہانی بیان کی۔ قاضی عبدالغفار نے ''لیلیٰ کے خطوط'' لکھی۔ لیکن ان کتابوں میں سطحی اور رومانی جذبات کو موضوعِ کتاب بنایا۔ ان کتابوں میں عورت مظلوم بھی نظر آئی اور موقعہ پرست بھی۔

قراۃ العین حیدر نے نثر کے میدان کو چُنا اور ناول نگاری میں بلند نام اور شہرت حاصل کی۔ ان کے ناول ''آگ کے دریا'' کو اُردو ادب کے کلاسیکل ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے ''چائے کے باغات'' اور دیگر ناولوں نے بے حد پذیرائی حاصل کی یہ ناول گرچہ ایک عورت کے تحریر کردہ تھے۔ لیکن انہوں نے صرف ان ناولوں میں عورتوں کے مسائل سے زیادہ معاشرتی مسائل کو اجاگر کیا۔ تاریخ کے گہرے مطالعہ کے پیش نظر انہوں نے قدیم تاریخ اور دور جدید کے ملاپ سے انوکھا حُسن پیدا کیا۔ معاشرے کے زندہ مسائل کو ماضی سے مربوط کیا۔

قراۃ العین حیدر بھی دانشورانہ مزاج اور حساس رویہ رکھتی تھیں۔ ایوب خان کے مارشل لاء کے نفاد کے بعد وہ یہ بھی کہتے ہوئے اس ملک سے رخصت ہوگیں کہ ''جہاں گفتگو اور تحریر اور اظہار پر بندش ہو۔ وہاں کیونکر رہا جاتا ہے''۔ اور پھر وہ ہندوستان شفٹ ہوگئیں اور اپنی وفات تک وہیں مقیم رہیں۔

یہ ایک حساس قلم کار خاتون کا پہلی آمریت کے خلاف مہذب احتجاج تھا.....

جمیلہ ہاشمی کے ناولوں اور افسانوں نے انہیں پاکستان کے ممتاز قلمکاروں میں لا کھڑا کیا۔ ان کے ایک ناول پر انہیں آدم جی ادبی انعام سے بھی نوازا گیا۔

یہاں میں چند خواتین قلمکاروں کا ذکر ضرور کروں گی۔ جنہیں اگرچہ ان کی تخلیقات پر ادبی پذیرائی اور مقام تو نہیں ملا لیکن ان کی تحریروں نے عورتوں میں مطالعے کا ذوق ضرور پیدا کیا۔ رضیہ بٹ۔ سلمٰی کنول، حمیدہ جبین ان کے ناول خالصتاً عورتوں کے مسائل کا احاطہ کئے ہوئے تھے..... ان کے ناول تو مقبول تھے ہی لیکن ان پر بنائی گئی فلمیں بھی کامیابی سے ہمکنار ہوئیں۔ ان ناولوں میں اگرچہ روزمرہ کے مسائل، ازدواجی زندگی، رشتوں کا تقدس اور حقوق کی نشان دہی کی گئی تھی متوسط طبقے اور درمیانی تعلیم یافتہ عورتوں اور لڑکیوں میں ان کے ناول ذوق وشوق سے پڑھے جاتے رہے ہیں۔ میں یہ لکھنے میں بجا ہوں کہ یہ عورتیں اگرچہ اپنے دور میں صحیح مقام اور مرتبہ نہیں حاصل کر پائیں لیکن وقت انہیں ''ڈسکور'' ضرور کرے گا۔

یہ خواتین عورتوں کے مسائل پر پہلی آواز تھیں..... کشور ناہید، پروین شاکر، شاہدہ حسن، زہرہ نگاہ شبنم شکیل جیسی خواتین کی شاعری سے اُردو ادب کی مانگ جگمگا رہی ہے۔

کچھ یونہی زرد زرد سی ناہیدؔ آج تھی
اوڑھنی کا رنگ بھی کچھ کھلتا ہوا نہ تھا

جیسے اشعار کی خالق کشور ناہید نے عورتوں کے مسائل پر دانشوانہ اپج کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے پاکستان کی عورت کے حقوق مسائل اور زیادتیوں کو عالمی

تناظر میں پیش کیا۔

عورت خواہ صومالیہ کی ہو یا سوات کی ۔ شکاگو کی رہنے والی ہو یا شکار پور میں اجتماعی زیادتی کا شکار ہونے والی۔ انہوں نے اسے اپنی تحریروں کا حصہ بنایا۔ ان کے قلم کی کاٹ اور جولانی آج بھی اپنی تاب پر ہے.....اب شاعری کے ساتھ ساتھ انہوں نے نثر کو بھی ذریعہ اظہار بنایا ہے۔ قومی اخبارات میں تواتر کے ساتھ ان کے کالم چھپتے ہیں جن میں انہوں نے عورت کے علاوہ دوسرے مسائل کو بھی اپنی تحریروں کا حصہ بنایا ہے۔

لڑکیوں کے دُکھ عجب ہوتے ہیں، سکھ اس سے عجیب
ہنس رہی ہیں اور کاجل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ

یہ دلنشین لہجہ، یہ انداز اور یہ عورت کے دُکھ یقیناً پروین شاکر جیسی حساس شاعرہ ہی بیان کر سکتی تھی۔

وہ عجیب دنیا کہ سب خنجر بکف پھرتے ہیں اور
کانچ کے پیالوں میں صندل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ

پروین شاکر کا تعلق کراچی سے تھا اور وہ اہل زبان ادبی گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ اپنے وسیلہ اظہار کے لیے انہوں نے شاعری کو اپنایا۔ ابھی وہ طالب علم تھیں کہ ان کی کتاب ''خوشبو'' اپنے نام کا حوالہ لیے ''کو بکو'' پھیل گئی۔ کئی کتابوں کی خالق یہ شاعرہ ادبی لحاظ سے تو ایک خاص مرتبہ اور مقام کے حوالے سے یاد رکھی جائے گی اس کے ساتھ عورت کے حقوق کے خاطر ان کی کاوشوں کو بھی کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ عورتوں کے ساتھ ساتھ وہ مردوں میں بھی اسی طرح پسند کی جاتی تھیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں ہی وہ شہرت حاصل کر لی تھی کہ جس کی تمنا میں ہی بہت سے شاعر اس دنیا سے چلے گئے۔

قلم کار خواتین کا یہ گروہ لسانیت، قبائل اور صوبوں سے ماورا ہو کر ادبی محاذ پر فتوحات حاصل کرتی رہیں۔ ان کے پیش نظر عورتوں کے مسائل اور کرب تھے۔ جنہیں وہ

تحریر کے ذریعے سامنے لائیں۔

بانو قدسیہ کے ناول ''راجہ گدھ'' کو کون بھول سکتا ہے۔۔۔۔''ضرب۔جمع۔تقسیم ان کا پی۔ٹی۔وی کا ایک ایسا سیریل تھا جس میں انہوں نے ایک کامیاب گلوکارہ جو عشق میں ناکام ہوتی ہے۔۔۔۔۔کے مسائل کا احاطہ کیا۔۔۔اور یہ کامیاب مگر ازدواجی زندگی میں ناکام عورت کی کہانی پہلی بار ٹی۔وی پر جرات مندی سے پیش کی گئی۔ڈاکٹر انور سجاد اور عابد علی نے بھی اس میں بہترین اداکاری کا مظاہرہ کیا۔۔۔۔نورالہدیٰ شاہ بھٹائی کے دیس کی بیٹی نے جب اپنے قلم سے پی۔ٹی۔وی کے لیے ایسی سیریلز لکھیں جن میں سندھ کے قبائلی رسم ورواج پر کڑی تنقید تھی۔پاکستان کے اکثر لوگوں کو پہلی بار پتہ چلا کہ ''ماروی'' کی دھرتی سے تعلق رکھنے والی عورت کسقدر مظلوم اور بے بس ہے۔

زاہدہ حنا کا تعلق ہندوستان کے علاقے بہار سے ہے۔مشہور شاعر اور انشائیہ نگار جون ایلیا کی بیوی تھیں۔شاعری اور نثر نگاری میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔انہوں نے ہمیشہ عورت کے حقوق کے بارے میں بہت جرات اور حوصلہ مند سے آواز اٹھائی۔عورت پر ہونے والی ہر زیادتی پر ان انہوں نے صدائے احتجاج بلند کی.....اور ہر طاقت سے ٹکر لی .....نہ صرف قلم سے بلکہ عملی طور پر عورتوں کے حقوق کی جدوجہد کے قافلے میں شریک سفر رہیں۔

☆☆☆☆☆

آئین پاکستان اور عورت

تمام شہری قانون کی نظر میں برابر اور قانون کے مساوی تحفظ کے مستحق ہیں اور جنس کی بناء پر شہریوں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں کیا جائے گا۔

(آئین پاکستان حصہ دوئم آرٹیکل ۲۵)

قومی زندگی کے تمام شعبوں میں عورتوں کی مکمل شمولیت کو یقینی بنانے کے لئے اقدامات کئے جائیں گے''۔

(آئین پاکستان حکمت عملی کے اصول ۳۴)

ہر پاکستانی عورت کو یا ایسی عورت کو جو پاکستان میں موجود ہو یہ بنیادی حق ہے کہ اسے قانون کا تحفظ حاصل ہو''۔

(آئین پاکستان۔ابتدائیہ ۴)

ہر پاکستانی عورت کو کسی بھی عام تفریح گاہ میں داخل ہونے یا جمع ہونے کا حق ہے اور کسی کے ساتھ کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جائے گا''۔

(آئین پاکستان بنیادی حقوق ۲۶)

بہ حیثیت پاکستانی شہری کسی عورت کو اس کی مرضی کے خلاف گھر میں یا کسی اور جگہ بند رکھنا غیر قانونی ہے''۔

(آئین پاکستان۔ حصہ دوئم بنیادی حقوق ۹)

بہ حیثیت پاکستانی شہری ہر عورت کو پاکستان بھر میں آزادانہ نقل وحرکت اور اس کے کسی بھی حصے میں سکونت اختیار کرنے اور آباد ہونے کا حق ہے''۔

(آئین پاکستان بنیادی حقوق ۱۵)

بہ حیثیت پاکستانی شہری ہر عورت کو انسانی وقار اور خلوت (پرایوسی) کا ایسا حق ہے جو ختم نہیں کیا جا سکتا''۔

(آئین پاکستان بنیادی حقوق ۱۴)

حقوق کی پامالی:

یہ ہیں وہ حقوق جو ہمیں ہمارے پیارے وطن پاکستان کے آئین نے دیئے ہیں۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، یہ حقوق پاکستان کے گلی کوچوں میں آئے دن پامال ہوتے رہتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ان حقوق کی پامالی کے خلاف عورتوں نے آواز نہیں اٹھائی ہے۔ ہم نے یہ فرض کر لیا ہے کہ ان قوانین کا تعلق ہماری روز مرہ کی زندگی سے نہیں ہے۔ جبکہ اگر ہم ہمت کریں تو اپنے حقوق کے لئے آواز اٹھا سکتی ہیں اور یقین کریں کہ اگر خواتین آئین پاکستان اور تعزیرات پاکستان کا صحیح استعمال کرنا سیکھ لیں اور ضروری قوانین کا علم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ملزم کو کیفر کردار تک پہنچا سکتی ہیں۔ یاد رکھئیے کہ آئین میں صاف صاف درج ہے۔

''کوئی شخص جو طاقت کے استعمال یا اظہار سے آئین پاکستان کے خلاف ورزی کرے گا یا خلاف ورزی میں مدد کرے گا وہ آئین پاکستان سے سنگین نداری کا مجرم ہوگا۔''

''بچوں کی تحویل''

1- بچوں کا قانونی سرپرست باپ ہوتا ہے اس پر لازم ہے کہ وہ بچوں کی پرورش، تعلیم اور شادی کے اخراجات ادا کرے خواہ بچے اس کی تحویل میں ہوں یا نہیں۔

2- سنی فقہ کے مطابق ماں بیٹے کو سات سال تک اور بیٹی کو سن بلوغت تک اپنے پاس رکھ سکتی ہے۔

فلاح و بہبود:

عدالت کو یہ حق حاصل ہے کہ بچوں کی فلاح و بہبود کو مدنظر رکھتے ہوئے تحویل کا فیصلہ کرے۔ فلاح و بہبود کے متعلق فیصلہ کرتے ہوئے عدالتیں اس بات کو مدنظر رکھتی ہیں کہ بچوں کو اچھی غذا، اچھی تعلیم، اچھی طبی سہولتیں کہاں بہتر مل سکیں گی مزید یہ کہ ماں اور باپ کے ذرائع آمدنی کیا ہیں۔

اگر ماں چاہے کہ بچے اس کی تحویل میں جائیں تو عدالت میں اس کو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ بچوں کا باپ کے گھر میں رہنا بہتر نہیں مثلاً باپ نے دوسری شادی کر لی ہے یا وہ بدکردار ہے یا مارتا پیٹتا ہے۔

فوری تحویل:

بچوں کی فوری تحویل کے لئے آئین کی شق نمبر **199** کے تحت فوجداری قانون کی

دفعہ 491 کے مطابق ہائی کورٹ میں رٹ پٹیشن دائر کی جاسکتی ہے۔

بچوں کی رضا:

ایک باشعور لڑکا/لڑکی (13 برس سے زائد عمر کے) بھی اپنی سرپرستی کے سلسلے میں رائے دے سکتے ہیں۔عدالت انہیں یہ حق دیتی ہے۔

ایک عورت سے بچے یا بچوں کو چھین لیا جائے تو وہ گارجین اینڈ وارڈ ایکٹ 1980ء کی شق نمبر 12 اور 25 کے تحت عدالت سے رجوع کرسکتی ہے اس کے علاوہ کریمنل (Criminal) پروسیجر سیکشن 100 کے تحت بچوں کو حاصل کرنے کے لئے وارنٹ نکلوا سکتی ہے۔

☆☆☆☆☆

دوسری شادی

عائلی قوانین 1961ء کے تحت شوہر پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی نہیں کرسکتا۔

دوسری شادی اس وقت ممکن ہے جب پہلی بیوی اس کی تحریری اجازت دے۔ دوسری صورت میں شوہر کو پہلی بیوی کے گھر کے علاقے کی مصالحتی کونسل سے اجازت لینی لازمی ہے۔ یہ اجازت مندرجہ ذیل بنیادوں پر مل سکتی ہے۔ (شق نمبر۔6)

1- اگر بیوی بانجھ ہو

2- بیوی ذہنی یا جسمانی طور پر معذور ہے۔

3- ازدواجی تعلقات قائم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہے۔

4- عدالت کے حکم کے باوجود شوہر کے ساتھ رہنے سے انکار کرتی ہے۔

بیوی کا قانونی حق:

اگر شوہر مصالحتی کونسل یا بیوی سے اجازت نامہ لئے بغیر دوسری شادی کرلے تو بیوی قانونی چارہ جوئی کرسکتی ہے۔ اس صورت حال میں شوہر کو قید اور جرمانے کی سزا ہے۔

اگر شوہر نے اب تک مہر ادا نہیں کیا تو اس صورت میں شوہر کو پورا مہر (معجّل و موجل) فوری ادا کرنے ہوں گے۔ اس کیس میں پہلی بیوی اپنی شادی ختم بھی کرواسکتی ہے۔

☆☆☆☆☆

جہیز اور شادی کا خرچ

1976ء میں نافذ کئے گئے جہیز اور شادی کے تحفوں پر پابندی کے قانون کے تحت شادی کی کل رسموں پر ڈھائی ہزار روپے (سکہ رائج الوقت پاکستان) سے زیادہ خرچ کرنا غیر قانونی ہے۔

دکھاوے کے لئے ان رسموں پر ہزاروں اور لاکھوں روپے خرچ کرنے والے قابل تعزیز مجرم ہیں اور ان پر مقدمہ دائر کیا جا سکتا ہے۔

قانوناً لڑکی کو پانچ ہزار روپے سے زیادہ جہیز نہیں دیا جا سکتا اور اگر سسرال والے یا دولہا کی جانب سے جہیز کا پرزور مطالبہ ہو تو یہ ایک شہری پر غیر قانونی دباؤ ڈالنے کے مترادف ہے۔ یہ بلیک میلنگ کے زمرے میں آتا ہے۔

شادی ایک سماجی معاہدہ (سوشل کنٹریکٹ) ہے اس میں غیر قانونی جہیز کا مطالبہ کرنا پاکستان پینل کوڈ **406/420** کے تحت آتا ہے اور قابل سزا جرم ہے۔ اگر لڑکی کے والدین ہمت کریں اور ایسے مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچائیں تو پاکستان سے اس رواج کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔

جہیز کا مطالبہ تعزیرات پاکستان **420** اور **406** کے تحت شدید جرم کے زمرے میں آتا ہے۔

1- جہیز کی نمائش کو عائلی قوانین کے تحت ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

2- گریڈ ۱۷ سے اوپر تمام سرکاری ملازمین و دیگر تمام عوامی رابطہ آفیسرز کے لئے ماسوائے رشتے داروں کے کسی اور سے اپنی اور اپنے بچوں کی شادی کے موقع پر تحائف لینا ممنوع کر دیا گیا ہے۔

3- تمام وہ جائیداد (جو حق وراثت میں ملی ہو) تحائف، جہیز اور بری جو دلہن کو دیئے جائیں گے وہ دلہن کی واحد ملکیت ہوں گے یہ تمام چیزیں ہر قسم کی پابندی سے مستثنیٰ ہوں گی۔

4- شادی کے ہر دو فریقین پر لازم ہے کہ وہ جہیز، جائیداد، تحفے وغیرہ اور دیگر اخراجات شادی کی فہرست نکاح رجسٹرار کو مہیا کریں تا کہ یہ فہرست پندرہ یوم کے اندر ڈپٹی کمشنر کے پاس بھجوائی جا سکے۔

5- اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والا مستوجب سزا ہوگا جس کی حد چھ ماہ قید ہے یا دس ہزار روپے جرمانہ یا دونوں سزائیں بیک وقت دی جا سکتی ہیں۔

6- حکومت تمام تحائف، جہیز جو قانون کی حد سے تجاوز کرے ضبط کر سکتی ہے۔ اس طرح ضبط شدہ مال یا رقم غریب لڑکیوں کی شادی پر خرچ کی جائے گی۔

7- ہر شخص کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ خلاف قانون منعقد ہونے والی ہر شادی کے خلاف اس علاقے کے ڈپٹی کمشنر سے مکمل کوائف کے ساتھ شکایت درج کروا سکتا ہے۔

یہ تمام احکامات عائلی قوانین مجریہ **1961**ء میں موجود ہیں اگر ان پر عمل نہیں ہو رہا تو یہ ہماری اپنی غلطی ہے۔ آپ کسی بھی غیر قانونی شادی کے خلاف عدالت سے رجوع کر سکتی ہیں اور قانون آپ کے ساتھ ہوگا۔

یہ برائیڈل ایکٹ **1967**ء کے تحت کیا گیا تھا لیکن **1967**ء کے ایکٹ میں اس کو ختم کر دیا گیا ہے اور اس ایکٹ میں جہیز کے متعلق پابندیاں موجود ہیں۔

☆☆☆☆☆

''نکاح''

نکاح نامے کی اہمیت:

مسلم فیملی لاز آرڈی نینس کے مطابق شادی کرنے کے لئے نکاح نامہ بھرنا اور اس کی تمام شرائط کو پُر کرنا لازمی ہے اور اس کا اندراج وارڈ نکاح رجسٹرار میں ہونا چاہئے۔ اس کی ذمہ داری نکاح پڑھانے والے پر ہے۔ اگر وہ ذمہ داری پوری نہیں کرتا تو وہ قابل سزا ہے۔

(مسلم عائلی قوانین 1961ء)

نکاح نامہ بیوی کے لئے کیوں ضروری ہے۔

1- اگر نکاح نامہ رجسٹر نہ ہو تو فریقین ہی میں سے کسی کے انتقال کے بعد خاندان کے لوگ وراثت کے حق سے محروم کرنے کے لئے شادی کو ہی غیر حقیقی اور متنازعہ ثابت کرنے کے لئے قانونی چارہ جوئی کر سکتے ہیں۔

2- زنا آرڈی نینس کے تحت سزا دیئے جانے کے مسئلہ نے نکاح کی رجسٹریشن کو بہت اہم بنا دیا ہے۔ اگر کسی میاں بیوی پر زنا کا الزام عائد کیا جائے تو سزا سے بچنے کے لئے خود کو شادی شدہ ثابت کرنا پڑے گا اور رجسٹرڈ نکاح نامہ کی عدم

موجودگی کی صورت میں نکاح ثابت کرنا انتہائی مشکل ہوگا۔

3- تنازعہ کی صورت میں اگر نکاح کا کوئی فریق نکاح کے وجود سے منحرف ہو جائے تو نکاح رجسٹر نہ ہونے کی صورت میں دوسرے فریق کے لئے اس کا وجود ثابت کرنا مشکل ہوگا۔

خاص شرائط:

نکاح نامے کے خانہ نمبر **17** میں اجازت دی گئی ہے کہ کسی بھی خاص شرط کو نکاح نامے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر لڑکا یا اس کے والدین ایسی شرائط نکاح نامے میں شامل کریں جس سے عورت کے قانونی حقوق کو نقصان پہنچے تو عدالتیں وہ شرائط تسلیم نہیں کریں گی۔

مہر:

اسلام میں اور پاکستانی قانون کے مطابق مہر دو طرح کے ہوتے ہیں۔

(۱) مہر معجّل اور (۲) مہر موجل

1- مہر معجّل:

بیوی شادی کے دوران کسی وقت بھی مہر مانگ سکتی ہے جو شوہر کو ادا کرنا ہوتا ہے۔ اس صورت حال میں ازدواجی تعلقات قائم ہونے کے بعد بھی بیوی اس وقت تک خاوند کے ساتھ رہنے سے انکار کر سکتی ہے جب تک فوری مہر ادا نہ کیا جائے۔ اگر شوہر انکار کرے تو تین سال کے اندر اندر بیوی مقدمہ کر سکتی ہے۔

2- مہر موجل (مہلت کے بعد ادائیگی)

یہ وہ مہر ہے جو بیوی کو طلاق یا شوہر کی وفات کے وقت مل سکتا ہے۔ بیوی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مرحوم شوہر کی جائیداد میں سے اپنا مہر حاصل کرے۔ نیز شوہر کے

خاندان پر لازم ہے کہ جائیداد تقسیم کرنے سے پہلے بیوہ کو مہر ادا کرے۔

مہر معجّل حاصل کرنے کے لئے شوہر کی وفات یا طلاق کے تین سال کے اندر اندر مقدمہ داخل کیا جا سکتا ہے۔

شوہر اگر بیوی کو اپنی جائیداد سے کچھ دینا چاہتا ہو تو صرف 3/1 حصہ گفٹ کی صورت میں دے سکتا ہے مگر یہ حصہ عورت کے مہر اور شرعی حصہ کے علاوہ ہو۔ شوہر کے لئے بیوی کو گفٹ دینے میں کوئی قید نہیں وہ زندگی میں جتنا چاہے بیوی کو دے سکتا ہے۔

مہر مثل کسے کہتے ہیں؟

جہاں حق مہر کی رقم کا تعین نکاح نامہ میں نہ کیا گیا ہو، اس صورت میں بیوی مہر مثل کی حق دار ہوتی ہے یعنی اگر مناسب مہر فریقین کے درمیان نہ طے ہوا ہو تو عدالت کو یہ حق پہنچتا ہے کہ مرد کی مالی حیثیت اور فریقین کی سماجی زندگی اور رہن سہن کو پیش نظر رکھ کر مناسب مہر کا تعین کرے۔ عدالت کی جانب سے طے شدہ مہر کو مثل کہتے ہیں۔

مہر کی رقم شادی کے دوران بڑھائی جا سکتی ہے۔

شرعی مہر:

بعض دولہا والے شرعی مہر پر اصرار کرتے ہیں ان کے علم میں یہ بات لائی جانی چاہئے کہ شرعی مہر چودہ سو برس پہلے ۳۲ دینار رکھا گیا تھا جو فی زمانہ پانچ تولے سونا کے برابر ہے۔ اسلام میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے کہ مہر شرعی مہر سے کم یا زیادہ نہ رکھا جائے۔

نان ونفقہ:

''ہر شوہر پر لازم ہے کہ وہ بیوی کو نان ونفقہ دیا کرے''۔

عدالتوں کے مطابق نان ونفقہ کا مطلب زندگی کی ضروریات اور تحفظ فراہم کرنا اور مدد کرنا ہے۔ نان ونفقہ میں خوراک، کپڑے، رہائش اور وہ تمام اخراجات شامل ہیں جو

ذہنی اور جسمانی صحت کے لئے ضروری ہیں۔ عدالتوں کے مطابق اس میں بچے کی ولادت کے اخراجات، جسمانی اور ذہنی صحت بھی شامل ہیں۔

''اگر شوہر نان ونفقہ نہ دے تو اس صورت میں بیوی مسلم عائلی قوانین کی شق نمبر 9 کے تحت نان نفقہ کا دعویٰ دائر کرسکتی ہے۔ نان ونفقہ کے لئے یونین کونسل کے ذریعے بھی دعویٰ دائر کیا جاسکتا ہے''۔

بیوی اور بچوں کے نان ونفقہ کے لئے فیملی کورٹ میں دعویٰ کرنا زیادہ مفید ہوتا ہے کیونکہ چیئرمین کو صرف ''سرٹیفکیٹ'' بیوی کے حق میں دینے کا اختیار ہے۔

تفویض شدہ طلاق کا حق:

نکاح نامے کے خانہ نمبر **18** میں عورتوں کو طلاق حاصل کرنے کا حق دیا گیا ہے۔ اگر عورت کے پاس طلاق تفویض کا حق ہو تو اسے طلاق حاصل کرنے کے لئے عدالتوں کے چکر نہیں لگانے پڑتے۔ وہ اپنے شوہر کو تحریری طور پر طلاق کا نوٹس دے کر اگر یونین کونسل کو اطلاع دے دے تو نوے **90** دن کے اندر عورت آزاد ہوسکتی ہے۔

نکاح کا آسان طریقہ کار:

1- اپنے علاقے کے رجسٹرڈ نکاح خواں سے نکاح نامہ حاصل کریں۔

2- اچھی طرح دیکھ لیں کہ کوئی بھی خانہ پہلے سے کاٹا ہوا نہ ہو۔

3- اگر جہیز دیا جارہا ہے تو ہر چیز کی مکمل لسٹ بنائیں اور گواہوں سے دستخط کروائیں۔

4- دولہا اور دلہن کی رضامندی دو گواہوں کے سامنے پوچھیں۔

5- نکاح نامہ میں مہر کی رقم کی وضاحت کریں اور یہ کہ اس میں سے کتنی رقم فوری ادا کرنی ہوگی اور کتنی طلاق یا وفات کی صورت میں، یہ بھی واضح کریں کہ مہر میں جائیداد نام لکھی جاسکتی ہے۔ یا نہیں (خانہ نمبر ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶،)

6- وضاحت کریں کہ شادی کے اس معاہدے میں کوئی خاص شرطیں ہیں یا نہیں (خانہ نمبر ۱۷)

7- وضاحت کریں کہ بیوی کو طلاق تفویض کا حق حاصل ہے یا نہیں (خانہ نمبر 18)

8- وضاحت کریں کہ شوہر کے طلاق کے حق پر کوئی پابندی یا شرط ہے یا نہیں (خانہ نمبر 19)

9- نکاح نامے کے علاوہ اگر نان ونفقہ اور حق مہر سے متعلق کوئی اور معاہدہ یا تحریری شرطیں ہوں تو ان کا ذکر کریں (خانہ نمبر 20)

10- اگر شوہر پہلے سے شادی شدہ ہو تو اسکی تفصیل لکھیں اور دوسری شادی کے اجازت نامے کی تفصیل (خانہ نمبر 21، 22)

11- دولہا، دلہن دو گواہوں اور قاضی سے نکاح نامے پر دستخط کروائیں۔

12- نکاح نامہ پر فوراً نکاح رجسٹرار سے دستخط کروائیں اور اسے رجسٹرڈ کروائیں۔

13- مکمل اور رجسٹرڈ نکاح نامے کی ایک کاپی دُلہن کو دیں۔

نکاح نامہ:

نکاح نامہ علاقے کے مستند مولوی سے حاصل کیا جا سکتا ہے جو رجسٹرڈ نکاح خواں ہو۔

☆☆☆☆☆

”نام“

بعض خواتین اپنے نام کے ساتھ والد یا شوہر کا نام اور ذات لکھتی ہیں مثلاً ”شازیہ عنایت“ یا ”عطیہ صدیقی“

عموماً شادی کے بعد عورتیں شوہر کا نام ”سرنیم“ استعمال کرنے لگتی ہیں۔ اس طرح شازیہ عنایت ”شازیہ رشید“ اور عطیہ صدیقی ”عطیہ قریشی“ بن جاتی ہیں۔

ایک عورت کو مکمل اختیار ہے کہ اگر وہ چاہے تو شادی کے بعد اپنا کنوار پن والا سرنیم استعمال کرتی رہے۔ قانوناً یہ بالکل لازم نہیں کہ وہ ضرور بالضرور اپنے نام کے ساتھ شوہر کا نام یا ذات شامل کرے۔

یہ اختیار ہر عورت کی پسند یا ناپسند پر منحصر ہے لیکن یہ بات ضرور ہے کہ شادی کے بعد اپنا پہلے والا نام استعمال کرنے والی لڑکیاں یہ ثابت کر دیتی ہیں کہ خاندان کا نام صرف لڑکوں سے نہیں چلتا۔ لڑکیاں بھی اس نام کو زندہ رکھ سکتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

"ملازمت"

"ہر پاکستانی عورت کو کوئی بھی جائز پیشہ یا مشغلہ اختیار کرنے کا یا کوئی بھی جائز کاروبار کرنے کا حق حاصل ہے۔"

(آئین پاکستان بنیادی حقوق۔18)

"کسی بھی عہدے پر تقرر کے لئے عورتوں سے امتیاز نہیں برتا جائے گا۔"

(آئین پاکستان بنیادی حقوق۔27)

قانون کے مطابق تمام تر سرکاری اداروں میں عورتوں کے لئے 5 فیصد کوٹہ مخصوص ہے۔اس پر عمل نہ کرنے کی صورت میں ایسے ادارے کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جاسکتی ہے۔

"ہر عورت کو زچگی کے متعلق مراعات مہیا کی جائیں گی"۔

(آئین پاکستان حکمت عملی کے اصول۔37)

اس آئینی نکتے کے مطابق ہر پاکستانی عورت کو ملازمت کے دوران 3 ماہ کی زچگی کی چھٹیاں لینے کا حق حاصل ہے اور یہ تنخواہ کے ساتھ دی جائیں گی۔

اس قانون کی خلاف ورزی پاکستان میں بہت عام ہے۔ یہ اس لئے ممکن ہو سکا ہے کہ ملازمت کرنے والی عورتوں نے اپنے آئینی اور قانونی حق کا استعمال نہیں کیا۔ پاکستانی آئین میں دیئے ہوئے تحفظ کے تحت کوئی بھی ادارہ خواہ وہ ملکی ہو یا غیر ملکی ہو۔ جو پاکستان میں کام کر رہا ہو، اس قانون کی خلاف ورزی کرنے پر عدالت میں لے جایا جا سکتا ہے اور اسے قانوناً مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ خواتین ملازمین کو ان کا حق دیں۔

عورتوں کے لئے علیحدہ غسل خانے:

پاکستان میں رائج فیکٹریز ایکٹ 1934ء کے تحت ہر مالک پر فرض ہے کہ وہ عورتوں کے لئے مناسب اور علیحدہ باتھ روم مہیا کرے جو مناسب طور پر روشن اور ہوادار ہوں۔

دفتروں میں علیحدہ غسل خانے:

دفتروں میں کام کرنے والی خواتین کو زیادہ تر اس بات کی بے حد تکلیف رہتی ہے کہ دفاتر کی عمارتوں میں خواتین کے لئے علیحدہ غسل خانوں کا کوئی انتظام نہیں کیا جاتا اس ضمن میں دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔

1- فیکٹریز ایکٹ 1934ء میں مصنوعات کے زمرے میں ذہنی کام کو بھی لایا جائے۔

2- آئین پاکستان کے دیئے ہوئے بنیادی حق 14 کو اٹھایا جائے جو کہتا ہے کہ ''ہر انسان کو وقار اور خلوت (پرائیویسی) پر ایسا حق ہے جو فسخ نہیں کیا جا سکتا۔''

خواتین کے لئے دفتروں میں علیحدہ غسل خانہ نہ ہونا بلاشبہ اس حق کی مکمل طور پر نفی کرتا ہے۔

ایک اچھے وکیل کی مدد سے دفتروں میں کام کرنے والی خواتین انتظامیہ کو مجبور کر سکتی ہیں کہ وہ خواتین کو علیحدہ غسل خانے کا قانونی حق دینے کا انتظام کریں۔ ہمت کیجئے

اور قانونی مدد حاصل کیجئے۔

دفتروں میں مردوں کی بدتمیزی:

دفتروں میں کام کرنے والی خواتین کے ساتھ ان کے افسروں یا ساتھ کام کرنے والے مردوں کا رویہ ہرگز ہرگز قانون سے بالاتر نہیں۔

اگر کوئی مرد افسر یا ساتھ کام کرنے والے مرد کسی خاتون سے بے ہودگی کی حرکت کرتا ہے یا کرنا چاہتا ہے تو اس کے خلاف تعزیرات پاکستان دفعہ 354 کے تحت کاروائی کی جاسکتی ہے۔

''یہ دفعہ تعزیرات پاکستان میں **''اسالٹ''** کے تحت آتی ہیں اگر ایسی صورت میں آپ عدالت کا رخ کریں تو یہ بات یقینی ہے کہ آپ مقدمہ جیت جائیں گی اور مجرم کو کیفر کردار تک پہنچائیں گی۔ کامیابی کے لئے آپ کو صرف ہمت کی ضرورت ہے''۔

☆☆☆☆☆

"آمدنی"

ہر پاکستانی عورت کو جو ملازمت یا کاروبار کرتی ہو قانوناً اپنی آمدنی کی کل رقم پر پورا اختیار ہے۔ وہ جس طرح چاہے اسے خرچ کر سکتی ہے۔

کسی دوسرے شہری شوہر یا سسرال والوں کو یہ حق نہیں کہ آمدنی کے خرچ کرنے میں کوئی رکاوٹ پیدا کرے یا دباؤ ڈالے ایک عورت اپنی آمدنی سے قانوناً۔

1- بوڑھے والدین کی کفالت کر سکتی ہے۔

2- چھوٹے بھائیوں یا بہنوں کی تعلیم کے اخراجات اٹھا سکتی ہے۔

3- والدین کو حج پر بھیج سکتی ہے۔

4- بھائیوں یا بہنوں کی شادی بیاہ کے اخراجات اٹھا سکتی ہے۔

آمدنی رکھنے والی خواتین سے ہم پر زور درخواست کرتے ہیں کہ وہ والدین اور بہن بھائیوں کی کفالت کرنے کے اپنے قانونی حق کو ضرور استعمال کریں۔ یقین کیجئے۔ کہ جب تک یہ رواج مقبول نہیں ہوگا اس وقت تک لڑکی کی پیدائش کا سوگ منایا جاتا رہے گا۔

☆☆☆☆☆

''طلاق''

قانوناً زبانی طلاق تسلیم نہیں کی جاتی ۔ طلاق صرف اس وقت مؤثر ہے جبکہ وہ تحریری ہو، نیز یونین کونسل کے چیئرمین کو طلاق کی تحریری اطلاع دی جائے۔

اطلاع وصول کرنے کے بعد کونسل بیوی کو اس کی ایک کاپی بھیجنے کی پابند ہے۔

تحریری طلاق ملنے کے نوے دن بعد طلاق قانونی طور پر مؤثر ہو جاتی ہے لیکن اگر بیوی حاملہ ہے تو طلاق بچہ کی پیدائش پر موثر ہوتی ہے۔

1- طلاق دیئے جانے کی صورت میں عورت سابق شوہر پر عدت کے زمانے 90 تک نان ونفقہ کا دعویٰ کر سکتی ہے۔

2- طلاق کے بعد وہ مہر کا بھی دعویٰ کر سکتی ہے۔

3- طلاق ملنے پر تین سال کے اندر اندر وہ جہیز کی واپسی کا بھی دعویٰ کر سکتی ہے۔

4- اگر عورت چاہے تو طلاق کے بعد عائلی قوانین کی شق نمبر 9 کے تحت سابقہ شوہر سے بچوں کا خرچہ حاصل کر سکتی ہے۔

عورت بدسلوکی کے باعث ذہنی یا جسمانی طور پر متاثر ہوئی ہو تو وہ پاکستان پینل کوڈ میں Assault کیس کے تحت دعویٰ کر سکتی ہے۔

اگر عورت عدالتی طلاق حاصل کرنا چاہئے۔

پاکستان میں عورت کا آئینی حق ہے کہ اگر وہ طلاق حاصل کرنا چاہے تو اس کی قانونی چارجوئی کر سکتی ہے اور طلاق حاصل کر سکتی ہے۔

عدالتی طلاق مندرجہ ذیل صورتوں میں مل سکتی ہے۔

1- شوہر چار سال سے زیادہ عرصے سے لا پتہ ہو

2- شوہر نے متواتر دو سال سے نان ونفقہ ادا نہ کیا ہو۔

3- شوہر بغیر کسی معقول وجہ کے تین سال سے ازدواجی ذمہ داریاں پوری نہ کر رہا ہو۔

4- شوہر نے قانونی ضروریات پوری کئے بغیر دوسری شادی کر لی ہو۔

5- شوہر کو سات برس یا اس سے زیادہ کی قید ہو چکی ہو۔

6- شوہر دو برس سے ذہنی طور پر معذور / کوڑھ کا مریض ہو یا کسی مردانہ پوشیدہ بیماری کا شکار ہو۔

7- یا پھر اگر شادی اس وقت کر دی گئی تھی جب بیوی کی عمر ۱۶ سال سے کم تھی۔ اس صورت میں ۱۸ برس کی ہونے کے بعد بیوی حق بلوغت استعمال کرتے ہوئے نکاح منسوخ کروا سکتی ہے۔

8- شوہر بیوی کے ساتھ ظالمانہ سلوک کرتا ہو۔

9- اس کے علاوہ کوئی اور ایسی بنیاد جسے مسلم قانون کے مطابق درست سمجھا جائے۔ مثلاً شوہر کی بدکرداری، بیوی پر تہمت لگانا، ذہنی اذیت دینا، گالم گلوچ کرنا، خط یا ٹیلی فون کے ذریعے دھمکیاں دینا۔

10- شوہر اگر غیر فطری طریقوں سے بیوی کے ساتھ ہم بستری کرنا چاہے تو بیوی اس بنیاد پر طلاق مانگ سکتی ہے۔

11- اگر شوہر ہم جنس پرست ہو تو بھی بیوی طلاق کا دعویٰ کر سکتی ہے۔

قانون میں اگر شوہر بیوی کے ساتھ بدسلوکی کرے اور اس پر تشدد کرے تو بہ حیثیت شہری عورت اس کے خلاف ایف آئی آر درج کروا سکتی ہے۔

خلع:

''خلع'' عورت کا دینی حق ہے جو اسے اسلام نے دیا اور پاکستان میں قانوناً رائج

ہے۔ خلع مندرجہ ذیل بنیادوں پر لی جاسکتی ہے۔

1- بیوی کے دل میں شوہر کے اعمال کے باعث شوہر کے لئے شدید نفرت پیدا ہوگئی ہو۔

2- شوہر اور بیوی میں صلح کی کوششیں ناکام ہوچکی ہوں۔

عموماً مثال یہی ملتی ہے کہ خلع مانگنے والی خاتون مہر معاف کردیتی ہے۔ دوسری صورت میں اگر مقدمے کے دوران شوہر تحریری مطالبہ کرے تو بیوی کو زرِ خلع کے نام پر ایک رقم شوہر کو دینی پڑتی ہے جس کا تعین اور فیصلہ عدالت کرتی ہے۔

عدالتوں پر قانوناً لازم ہے کہ وہ طلاق وخلع کے مقدموں کا فیصلہ چار ماہ اندر اندر کریں۔

حلالہ:

حلالہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی عورت کو طلاق ہوچکی ہو اور وہ عدت گزار چکی ہو مگر بوجوہ وہ اپنے سابقہ شوہر کے ساتھ نکاح کی متمنی ہو تو اسلامی شریعت کی رو سے وہ کسی دوسرے مرد کے ساتھ نکاح کرے اور اس کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کرے۔

- پھر اگر کسی وجہ سے وہ شوہر مرجائے یا اس کو طلاق دے دے اور وہ عدت گزار لے تو یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے پہلے شوہر سے نکاح کرے۔

☆☆☆☆☆

''شادی''

کم عمری کی شادی:

پاکستانی قانون کے مطابق بچپن کی شادی ممنوع ہے۔ 16 سال سے کم عمر لڑکی کی شادی کرنے پر والدین اور نکاح پڑھانے والے کو جرمانہ اور قید کی سزا دی جاسکتی ہے۔

(قانون امتناع ازدواج اطفال 1929ء)

''اگر شادی کے وقت لڑکی کی عمر **16** سال سے کم ہے تو قانون اسے اجازت دیتا ہے کہ بالغ ہونے پر لڑکی اس شادی کو ختم کرسکتی ہے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ میاں بیوی کی حیثیت سے نہیں رہ رہے ہوں۔ دوسری صورت میں بالغ ہونے پر لڑکی کو عدالتی طلاق کے لئے کارروائی کرنی ہوگی''۔

بالغ لڑکی کی شادی:

18 سال سے بڑی عمر کی لڑکی اپنی مرضی سے شادی کرسکتی ہے۔ اگر اس کے پاس رجسٹرڈ نکاح نامہ ہو تو اس کے والدین شادی فسخ نہیں کرواسکتے۔

دوسری صورت میں یعنی اگر نکاح نامہ نہ ہو تو لڑکی کے حلفیہ بیان (یعنی ایفی ڈیوٹ) کے ذریعے نکاح ثابت ہوسکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

''خواتین کی تعلیم اور قومی ترقی''

کوئی قوم یا ملک اُس وقت تک ترقی نہیں کرسکتی جب تک وہ تعلیم یافتہ نہ ہو۔ سر سید احمد خان جو ہمارے محسن ہیں انہوں نے یہ محسوس کرلیا تھا۔ کہ مسلمان مرد اور عورتیں جب تک تعلیم یافتہ نہیں ہونگے مسلمان قوم ترقی نہیں کرسکتی۔ اس لیے اُنہوں نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی قائم کی۔ قیامِ پاکستان کی تحریک میں جب قائداعظمؒ نے یہ کہا کہ ''پچاس فیصد آبادی کو گھروں میں قید رکھ کر کوئی بھی جنگ آزادی لڑی نہیں جاسکتی'' اور پھر قائداعظمؒ نے عملی سیاسی مظاہرے کے لیے محترمہ فاطمہ جناحؒ کو ہمیشہ ساتھ رکھا۔ آزادی کی تحریک نے خواتین کے لیے جدید تعلیم پر توجہ مرتکز کی۔

خواتین ہماری آبادی کا آدھا حصہ ہیں تو جب تک یہ آدھا حصہ معاملات میں برابر کا شریک نہ ہو ہم ترقی کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے سیاسی، سماجی اور معاشی ترقی میں خواتین کو مساوی سطح پر لانے کے لیے تعلیم کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر معاشرتی بیداری میں اولین چیز تعلیم ہے۔ ایک پرانا مقولہ ہے کہ! ''مجھے پڑھی لکھی مائیں دو اور میں تمہیں شائستہ اور ترقی یافتہ معاشرہ دونگا۔'' اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ایک پڑھی لکھی باشعور ماں ایک ایسے معاشرے کو جنم دیتی ہے جو قوم کی تقدیر بدل دے اور ترقی کی بنیاد یہاں سے

شروع ہوتی ہے۔مگر صرف اس سے یکدم تبدیلی نہیں آتی ہے۔

جب تک ہم خواتین کو ایک انسان ایک ذمہ دار شہری کی نظر سے دیکھیں گے نہیں، اس وقت تک ملک کی ترقی میں تعلیم یافتہ خواتین کے کردار کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ دنیا میں انقلاب کی تاریخ کا جائزہ لیں تو نظر آتا ہے کہ روسی انقلاب کے فوراً بعد سب سے زیادہ اسکول لڑکیوں کے کھولے گئے۔ ہر جگہ لڑکیوں کے لیے کالج اور یونیورسٹی میں لڑکوں کے برابر جگہ رکھی گئی۔ خواتین کو نہ صرف تعلیم دینے کے لیے مقرر کیا گیا بلکہ ڈاکٹرز انجینئر اور سائنس کے دیگر اہم شعبوں میں خواتین کو فوقیت دی گئی۔ یہی لائحہ عمل بعد میں انقلاب قبول کرنے والے ممالک نے اختیار کیا۔

یورپ میں انڈسٹریل انقلاب کے بعد وہاں بھی خواتین کی اہمیت کو سمجھا گیا اور اُن کو زندگی کے ہر شعبہ میں شامل کیا گیا۔ قائداعظمؒ نے پاکستان کی تحریک کے دوران اور پھر پاکستان کے بن جانے کے بعد بھی اپنی ہر تقریر میں خواتین کی تعلم پر زور دیا اور یہ بھی کہا کہ پاکستانی خواتین کو اپنے بھائیوں کے شانہ بشانہ قومی ترقی میں حصہ لینا چاہیے۔ اب میں پاکستانی اور مسلمان خواتین کے بارے میں بات کرنا چاہوں گی۔

اسلام جو ایک انقلابی مذہب ہے جس نے ایک قبائلی معاشرہ میں جہاں لڑکیوں کو غیرت کے نام پر زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔

اُن کے کوئی حقوق نہیں تھے وہ اپنے رشتہ دار مردوں کی ملکیت سمجھی جاتی تھیں۔ اُس معاشرہ میں خاتون کو برابری کا حق دیا خواتین اور مردوں کو پیدائش کی بنیاد پر نہیں بلکہ اُن کے عمل کی بنیاد پر مقام دینے کی بات۔ سزا اور جزا برابر رکھی جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خواتین مردوں سے کم تر نہیں۔ خواتین کو وراثت میں حق دیا۔ شادی میں اُن کی رضا مندی کو اُن کا حق سمجھا۔ جہاں قرآن نے خواتین اور مردوں دونوں کو قرآن پڑھنے کے لیے کہا وہیں میرے پیارے نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے کہا کہ علم حاصل کرنے کے لیے اگر چین جانا پڑ جائے تو جاؤ یہ حکم صرف مردوں کے لیے نہیں تھا خواتین کے لیے بھی تھا۔

عالم اسلام کی آبادی ایک ارب بیس کروڑ ہے جس کی نصف خواتین ہیں۔ مسلم معاشروں کی خواتین کو باقی دنیا بھر کی خواتین سے بالکل علیحدہ حیثیت میں پیش کیا جاتا ہے اُن کو اسلام کے نام پر اور اُن کے دائرہ کار کو مردوں سے الگ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس کی وجہ سے ملک کی آبادی کا ایک بڑا حصہ تعلیم اور ملک کی ترقی سے الگ ہو جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ ملک ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے ہیں۔ یہ بات بھی سوچنے والی ہے کہ تعلیم کا مقصد محض دستخط کرنا یا محض ڈگریاں حاصل کرنا نہیں ہوتا۔ تعلیم کا مقصد ذہنی تربیت، ذہنی بیداری اور شعور کی پرورش ہوتا ہے۔

''ہمارے جیسے ملک جو ترقی پذیر اور زرعی ممالک ہیں جن میں تعلیم کا نکتہ انداز نصابی نہیں بلکہ تربیتی اور خود احتسابی پر منحصر ہو تو فروغ علم اور تحصیل علم کے سرچشمے زیادہ وسعت حاصل کر سکتے ہیں۔ کہ تعلیم کا مقصد صرف کتاب پڑھنا نہیں بلکہ موجودہ غربت، جہالت، گندگی اور بیماریوں کو مٹانا ہے''۔

تعلیم کو جدید تقاضوں کے مطابق بنانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ تعلیم کے معیار اور حقیقی ارتقاء کی طرف توجہ کی ضرورت ہے۔ ہمیں نصاب کو زیادہ جدید بنانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ٹیچرز کو سہولیات فراہم کرنے کے ساتھ زیادہ سے زیادہ کوالیفائیڈ ٹیچرز رکھنے چاہیے اور اُن کو بھی جدید طریقہ تعلیم کی ٹریننگ دینا ہوگی۔ زمین اور انسان کے رشتے، زمین سے حاصل پیداوار کے سائنسی اور فنی طریقے، ٹیکنالوجی جس کے ذریعہ چھوٹی صنعتیں لگانا ہو ہمیں دیہات اور شہروں کے اسکول کے نصاب، کو الگ الگ سمجھنے کی ضرورت ہے۔ صرف عام مضامین میں بی اے یا ایم اے کی ڈگری لیکر نوکری کی تلاش میں بے روزگاروں کا اضافہ کرنے سے ترقی نہیں آتی۔ غربت، افلاس اور بھکاری پن کا طوق اُتارنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ہم خواتین کو ایسی معیاری تعلیم سے آراستہ کریں جس سے وہ سائنس اور ٹیکنالوجی سمیت دیگر شعبوں میں خدمات سرانجام دے کر ملک کو تیزی سے خوشحالی اور ترقی کی منزل

تک پہنچائیں۔ ترقی کے لیے اس علم کی ضرورت ہے جو مارکیٹ کی ضرورت ہے۔ جو منفی مساوات اور خواتین کی بااختیاری اور ترقی میں حائل رکاوٹوں کو دور کر سکے۔ جو علم کے زور پر خواتین کو اپنے ملک کے اندر پالیسی سازی میں شریک کرے۔ سن **2000**ء میں جب پاکستان کی خواتین کو یہ موقع دیا گیا کہ وہ غیر روایتی شعبوں میں بھی کام کر سکتی ہیں تو معاشرہ کے نامہربان ہونے کے باوجود خواتین اور لڑکیوں نے تعلیمی میدان میں بہترین کارکردگی دکھانے کے ساتھ ساتھ ہر شعبہ میں کامیابیاں حاصل کیں میڈیا کے ہر شعبہ میں نمایاں حصہ لیا۔ وہ پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک میڈیا ہو اینکر سے لے کر پروڈیوسر فوٹو گرافر اور ایڈیٹوریل تک ہر جگہ اس وقت بہترین کارکردگی دکھا رہی ہیں..... پولیس فورس کے بھی ہر شعبہ میں خواتین موجود ہیں پولیس کی سپاہی سے لے کر ایس پی، ڈی ایس پی تھانوں میں انسپکٹر اور محرر بھی خواتین ہیں۔ پولیس کمانڈو ہو یا ٹریفک پولیس.....رینجرز میں بھی خواتین ہیں، ملٹری کی لڑاکا فوج میں ائیرفورس میں جیٹ پائلٹ جبکہ نیوی میں بھی آج خواتین ملک کے محافظوں میں شامل ہیں۔

کسی زمانہ میں فلموں اور ڈراموں میں خواتین صرف آرٹسٹ کا رول ادا کرتی تھیں مگر آج وہ فلم پروڈیوسر، ڈائریکٹر ہیں ان میں سے چند ڈائریکٹر پروڈیوسر خواتین نے انٹرنیشنل ایوارڈز لے کر ملک کا نام روشن کیا ہے۔ سن **2000**ء میں جب لوکل گورنمنٹ میں خواتین کو **33** فیصد حصہ دیا گیا تو یونین کونسل، تحصیل/ٹاؤن کونسل اور ڈسٹرک کونسلرز نے گراس روٹ پر عوام کے بہت کام کیے۔ جس کا ذکر مختلف **NGO,S** نے اپنی ریسرچ میں کیا ہے۔ ملک کے کئی اضلاع، تحصیل اور یونین کونسل میں خواتین نے ناظم اور نائب ناظم کا ڈائریکٹ الیکشن لڑا اور اس میں سے بہت سوں نے کامیاب ہو کر عمدہ کارکردگی دکھائی۔

''سینٹ میں، نیشنل اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں میں جب **2002**ء میں خواتین کو **17** فیصد نمائندگی **14** سال بعد دی گئی تو پانچ سالوں میں خواتین نے چاہے وہ حکومتی ہوں یا اپوزیشن کی حصہ مردوں

سے زیادہ کام کیا۔ حالانکہ خواتین تقریبا 21 فیصد تھیں اور مرد حضرات 79 فیصد تھے مگر کارکردگی خواتین کی زیادہ تھی ۔ جو دو NGO نے رپورٹ کے ذریعہ بتایا ہے۔ یہ سب اس لیے ہو سکا کہ خواتین کو موقع فراہم کیا گیا۔ دوسرے تعلیم نے اُن کو ملک کی ترقی میں بھرپور طریقہ سے کام کرنے کا ادراک دیا۔ آج بھی ہر شعبہ زندگی میں چاہے وہ صنعت کاری ہو یا تجارت ، Real Estate یا بلڈرز ہوں یا آرکیٹیکٹ ہوں کامیابیاں حاصل کر رہی ہیں۔ اپنے وطن کی ترقی کا خواب دیکھنا اچھا لگتا ہے''۔

کیوں نہ ہم آج ایک عہد کریں کہ قائداعظمؒ ، علامہ اقبالؒ ، اور مادرِ ملتؒ کے خواب کو پورا کرنے کے لیے پاکستانی عورت امن، علم و یکجہتی کا علم اُٹھا کر ایک نئی دنیا جو آج سے بہتر ہوگی بنا کے دم لیں۔ ''دنیا جو میری ہے نہ تیری ہے بلکہ ہم سب کی ہے۔''

☆.....☆.....☆

پاکستانی عورتوں نے کیا کھویا؟ کیا پایا؟

پاکستان کی آبادی کا تقریباً 50 فیصد خواتین پر مشتمل ہے مگر پیدائش کے وقت سے ہی پاکستانی خواتین کی اکثریت کے لیے روشن امید نہیں ہوتی ۔ مردوں کی نسبت تعلیم، صحت، روزگار یا قانونی حیثیت ہو پاکستانی خواتین عالمی سطح پر اور جنوبی ایشیاء کے ممالک کے مقابلے میں پس ماندہ ہیں۔ بعض شعبوں میں منفی تفاوت میں اضافہ ہوا ہے اس کی سب سے بڑی وجہ معاشرتی رویہ ہے جو خواتین کو انسان سمجھنے کو تیار نہیں بلکہ خواتین کے کام کے صلے کو کم کرتے ہیں۔ خاص طور پر پاکستان میں عورتوں کے کام کو شمار نہیں کیا جاتا جبکہ ایک سروے کے مطابق 3 کروڑ خواتین زرعی کام کرتی ہیں ۔ دیہات میں 70 فیصد کام خواتین کی ذمہ داری ہے مگر ان کو ورک فورس کا حصہ نہیں گنا جاتا۔ شہروں میں دفتری کاموں، میڈیا میں، سیل فون کمپنیوں اور بینکوں میں تقریباً 20 لاکھ خواتین کام کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ غیر روایتی اور روایتی شعبوں میں کام کرنے والی خواتین بھی تقریباً ڈیڑھ کروڑ ہیں۔

قومی آمدنی میں ان خواتین کا بہت بڑا حصہ ہے مگر قومی سطح پر نامناسب اعداد و شمار کی وجہ سے Recongation نہیں ہوتی اور اسی لیے معاشی پالیسیوں کی پلاننگ میں خواتین کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور چونکہ منصوبہ ساز کمیٹیوں میں خواتین کی نمائندگی یا تو ہوتی نہیں یا بہت ہی کم ہوتی ہے۔ اسی طرح بجٹ بنانے کی کمیٹیوں، سماجی شعبوں

اور معاشی ترقی کے شعبوں میں خواتین کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

اقوام متحدہ کے ''ڈویلپمنٹ فنڈ برائے خواتین'' کی رپورٹ کے مطابق دنیا کی دو تہائی عورتیں ناخواندہ ہیں اور پاکستان میں تو خواتین کی شرح خواندگی شہروں میں 23 فیصد اور دیہات میں 15-14 فیصد سے زیادہ نہیں جو دنیا میں سب سے کم ہے۔ خواتین پر تشدّد دکارحجان بڑھ رہا ہے۔ گزشتہ سال سندھ میں کاروکاری کے نام پر 1202 خواتین قتل ہوئیں۔ پنجاب 2010ء میں تقریباً 4000 خواتین پر ظلم، تشدد ہوا جس میں قتل، جنسی زیادتی، اغوا، کاروکاری اور سینکڑوں خواتین کو جہیز نہ لانے کی پاداش میں جلا کر قتل کر دیا گیا۔ بڑی تعداد میں چھوٹی بچیوں کو ''ونی'' کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ پاکستان میں عام طور پر زیر حراست خواتین سے پولیس بدسلوکی کرتی ہے۔

خواتین کی خرید وفروخت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ ہر سال کئی سو عورتوں کو عصمت فروشی کے دھندے میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ خواتین کی اس حالت کی وجہ یہ کہ خواتین یوں تو آبادی کا نصف ہیں لیکن حکومتوں میں خواتین کی نمائندگی بہت کم ہے اس کے نتیجے میں ملک کے قانون بنانے والے اداروں اور منصوبوں میں خواتین کی سوچ کی عکاسی نہیں ہوتی۔ وہ قانون اور پالیسیاں جن کا خواتین کی زندگیوں سے گہرا تعلق ہے ان کی بنانے میں بھی خواتین کو شامل نہیں کیا جاتا۔ اسی لیے بہت سے قوانین خواتین اور مردوں کے درمیان امتیاز برتستے ہیں۔ حکومت کے بہت سے منصوبوں اور پروگراموں میں خواتین کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

سیاسی جماعتوں میں خواتین کے ونگ میں موجود اور بڑی تعداد میں خواتین سیاسی جماعتوں میں ہیں مگر پارٹیوں کے اندر بھی خواتین کو اہم فیصلوں میں شرکت کا حق نہیں ملتا اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاسی جماعتوں کے لیڈروں کے اندر خواتین کے حقوق کے بارے میں کوئی Will نہیں ہے۔ جب تک خواتین سیاسی پارٹیوں کے ہر سطح پر فیصلہ سازی میں شامل نہ ہوں گی اسی طرح حکومتوں میں فیصلہ سازی میں ان کی شرکت نہیں ہوگی اس وقت تک ان

کونظر انداز کیا جاتا رہے گا۔

پاکستان کے قیام کو 65 سال ہو گئے ہیں مگر آج بھی خواتین کو انتخابات میں جنرل سیٹ پر حصہ لینے کے لیے پارٹیاں ٹکٹ نہیں دیتیں۔ صرف ان چند خواتین کو ٹکٹ دیا جاتا ہے جن کی موروثی سیٹ ہیں یا کسی وجہ سے ان کے باپ، بھائی یا شوہر الیکشن نہیں لڑ سکتے۔ اس وقت Reserve سیٹ پر خواتین صوبائی، قومی اسمبلیوں اور سینٹ میں ہیں وہ کسی سیاسی جماعت کی وجہ سے نہیں بلکہ اکٹی وسیوٹ خواتین کی کوشش کے نتیجہ میں صدر مشرف نے LFO کے ذریعہ یہ سیٹیں خواتین کو دیں۔

''قائداعظمؒ'' نے کہا تھا کہ ''کوئی ملک اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک خواتین مردوں کو شانہ بشانہ ملک کی ترقی میں حصہ نہ لیں گی''۔ 8 مارچ دُنیا بھر کی خواتین کا عالمی دن ہوتا ہے اس حوالے سے پاکستان کی خواتین کا یہ مطالبہ ہونا چاہیے کہ ''جب تک کسی سیاسی جماعت میں ان کی نمائندگی 33 فیصد نہ ہو اس جماعت کو الیکشن میں حصہ نہ لینے دیا جائے''۔ اور دوسرا مطالبہ ہے کہ مخصوص نشستوں کے علاوہ قانون بنایا جائے کہ ہر جماعت خواتین کو جنرل سیٹ پر لڑنے کے لیے کم سے کم 15 فیصد ٹکٹ دیں۔

خواتین کے حقوق دراصل انسانوں کے حقوق ہیں۔ خواتین کو حق دینا دراصل سماج کو حق دینا ہے جوں جوں خواتین اپنے حقوق حاصل کرتی جائیں گی اس رفتار سے ملک ترقی کرے گا۔

☆☆☆☆☆

1886ء سے 1988ء تاریخی پس منظر

آزادی کے وقت پاکستانی خواتین جس پوزیشن اور سٹیٹس سے لطف اندوز ہوئیں۔ وہ انیسویں صدی کے اواخر کے ہندوستانی سرگرم مردوں اور عورتوں کے مرہون منت تھا۔ جن کے عمل اور خیالات مسلمان خواتین کے روایتی کردار اور مقام کو قائم رکھنے اور تبدیل کرنے کے براہِ راست ذمہ دار تھے۔''

پہلے پہل ''تحریک اصلاح خواتین'' (جس میں مسلم خواتین نے شرکت کی) نے خواتین کیلئے جدید تعلیم پر توجہ مرتکز کی..... یہ مسئلہ سب سے پہلے 1886ء میں آل میل محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے موقع پر اُٹھایا گیا۔ آنے والے برسوں میں خواتین نے اپنے آپ کو معاشروں اور گروہوں کے ساتھ ساتھ سیاسی میدان میں بھی منظّم کرلیا تھا، تاکہ وہ خواتین کے حقوق کیلئے حمایت حاصل کرسکیں، لیکن ساتھ ساتھ خواتین کو سیاسی طور پر متحرک کیا۔ 1908ء میں لاہور میں انجمن خواتین اسلام بنائی گئی اور اسلام کے دائرہ کار کے اندر خواتین کے حقوق، سماجی اصلاحات اور تعلیم کی طرف توجہ کی 1918ء میں آل انڈیا مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگریس نے خواتین کی حق رائے دہی کیلئے حمایت کی۔

1928ء میں فرانس سے سترہ سال پہلے خواتین کو ہندوستان میں مردوں کے برابر حق رائے دہی کیلئے حمایت کی اور 1928ء میں فرانس سے سترہ سال پہلے خواتین کو

ہندوستان میں مردوں کے برابر حق رائے دہی مل گیا، گورنمنٹ آف انڈیا کے ایک 1935ء ایکٹ کے تحت چھیاسٹھ لاکھ خواتین کو حق رائے دہی ملا اور پہلی بار خواتین کو فیڈرل اسمبلی کی 250 میں سے 9 نشستیں اور کونسل آف سٹیٹ کی 150 میں سے 6 نشستیں الاٹ کی گئیں۔

خواتین رائے دہندگان میں اضافہ کیلئے تعلیم کی شرط کو محض خواندہ اور رجسٹرڈ مرد رائے دہندگان کی بیویوں تک نرم کیا گیا۔ اسی خصوصی رعایت کے باوجود خواتین نے صرف چھ فیصد رائے دہندگان میں اضافہ کیا۔ تاہم 1936ء اور 1937ء کے انتخابات میں صوبائی اور مرکزی پارلیمنٹ کیلئے (کچھ مشترکہ رائے شماری کے ذریعے) 80 خواتین منتخب ہوئیں۔ ان میں ایک خاتون کو وزیر، دو پارلیمانی سیکرٹریز، ایک ڈپٹی سپیکر اور ایک ایوان بالا میں ڈپٹی پریذیڈنٹ بنائی گئیں۔ عالمی سطح پر انڈیا، روس اور امریکہ کے بعد خواتین ارکان اسمبلی کے لحاظ سے تیسرے نمبر پر آیا۔ مسلم خواتین کی نشستیں جداگانہ انتخابات کے ذریعے پر کرنا تھیں۔ اور پنجاب اور بنگال میں ان کو صرف خواتین رائے دہندگان نے منتخب کرنا تھا۔ قانونی محاذ پر، مسلم پرسنل لاء (شریعت) اپیلی کیشن ایکٹ 1937ء (xxv آف 1937ء) کے تحت مسلمان خواتین کو ان کے حقوق وراثت کی یقین دہانی کرائی گئی۔ ایسا حق جس کی مسلم اصول فقہ کے مطابق ضمانت دی گئی ہے لیکن رسم ورواج کے تحت اس سے انکار کیا جاتا ہے۔

1946ء کے الیکشن میں دو مسلم خواتین بیگم جہاں آرا شاہنواز اور بیگم شائستہ اکرام اللہ، مرکزی قانون ساز اسمبلی کیلئے منتخب ہوئیں۔ اسی سال مسلمان خواتین نے، مسلم لیگ کو وزارت دینے کیلئے حکومت کے انکار کیخلاف احتجاجی جلوس ترتیب دیئے اور نکالے۔ خواتین احتجاج کنندگان پر تشدد کیا گیا اور ان کو گرفتار بھی کیا گیا۔ پہلے پہل یہ کارروائیاں صرف لاہور اور کراچی تک محدود تھیں تاہم جنوری 1947ء کی سول نافرمانی کی تحریک نے پٹھان خواتین، جن کو برصغیر میں سب سے زیادہ قدامت پسند مانا جاتا ہے، کو بھی محرک

کر دیا۔ انہوں نے تحریک کی حمایت میں پہلی دفعہ عوامی سطح پر بے پردہ ہو کر مارچ کیا، سب سے زیادہ دلچسپ سیاسی شمولیت کی قسم وہ خفیہ تنظیم تھی جس کو "وارکونسل" کہتے تھے جو پٹھانوں نے تشکیل دی گئی۔ جس میں خواتین کی مدد سے آزادی تک ایک زیرزمین ریڈیو سٹیشن کام کرتا رہا۔

1947ء تک مسلم خواتین نے سیاسی میدانِ جنگ میں اپنی کاروائیوں اور مہارتوں کا اظہار کر دیا تھا۔ انہوں نے تحریک پاکستان کیلئے فنڈ قائم کرلیا تھا۔ خواتین کو متحرک کیا، گلیوں میں ظلم و جبر کے خلاف جنگ کی اور خواتین کی تعلیم ایسی شکایات پر خطاب کیا تھا۔ ہر شخص کو یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ خواتین کی کثیر تعداد خواتین کے حقوق سے متعلقہ مسائل یا ان کے سیاسی اور قانونی مقام کیلئے متحرک نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کی بجائے ان کا مقصد مسلمانوں کیلئے ایک الگ وطن کا حصول تھا۔ تاہم سرگرم خواتین کارکنوں کا یہ پختہ یقین تھا کہ خواتین کو اس نئے معاشرے میں جائز مقام حاصل ہوگا۔ جس کو معرض وجود میں لانے کیلئے وہ مدد کر رہی ہیں۔

یہ بات شروع سے ہی عیاں ہے کہ خواتین کی غیر سرکاری تنظیموں کا وجود، ان کی کارگزاری کا شعبہ، طرزِ عمل، ترجیحات اور خواتین کے مسائل پر توجہ مرتکز کرنا (یا اس کا فقدان) ہمیشہ خواتین کی سیاسی شرکت سے لازم وملزوم رہا ہے۔ اس کے نتیجہ میں خواتین کی غیر سرکاری تنظیموں کے ایجنڈوں کو نہ صرف سیاسی قوت بلکہ حکومت وقت کے خواتین کے مسائل کے وعدوں کے ادراک کی واضح اثر پذیری ہوتی ہے۔

شاید تحریک پاکستان کی قیادت کرنے والوں اور خواتین کے حقوق کی وکالت کرنے والوں کے کامیاب اتحاد اور اعتماد کی وجہ سے نئے معرض وجود میں آنے والے ملک میں خواتین کی جماعتیں دو عشروں سے بھی زائد مدت تک اس یقین میں مبتلا رہیں کہ حکومت خود بخود خواتین کے حقوق کو وسعت دے گی اور سماجی، معاشی یا سیاسی ہر سطح پر ان کی شرکت کیلئے کوئی طریقہ کار اپنائے گی۔ نتیجتاً 1980ء کی دہائی تک خواتین کی جماعتوں کے ساتھ

یا سیاستدانوں سے بہت کم تعاون کیا۔ ضیاء حکومت تک (1977ء تا 1988ء) خواتین کے تمام حقوق کو منسوخ کرنے کی دھمکیاں دی گئی تھی۔ اس لیے خواتین کی جماعتوں نے خواتین کی وکالت کیلئے لابی بنانے کی ضرورت محسوس کی۔''

1947ء سے 1970ء ابتدائی سال آزادی کے وقت خواتین کو تعلیمی، سیاسی اور معاشی شمولیت کے حقوق مل گئے۔ لیکن مساوی حقوق کے مطالبہ کی قدامت پسند گروہوں نے مخالفت کی۔ جن کے پاس کافی دباؤ تھا۔ (یا ان لوگوں نے دوسری سیاسی قوتوں کے ذریعے حاصل کرلیا تھا) کہ وہ خواتین کو ترقی کے عمل میں شریک کرنے کی ہم آہنگی کو روک سکیں، یہ حقیقت ہے کہ خواتین کی قلیل تعداد نے، جو خواتین کے حقوق کیلئے لابنگ کررہی تھی، خواتین کے ان مسائل کو غلط راہ پر ڈالنے اور ماند کرنے میں مدد فراہم کی۔ جن کو پالیسی ساز اہم مسائل کی نظر سے دیکھ رہے تھے، مثال کے طور پر 1948ء میں قومی اسمبلی کی خواتین ممبران نے خواتین کے معاشی حقوق کے تحفظ کیلئے ایک بل تجویز کیا۔ بل کو اس وقت تک ایجنڈے میں شامل نہیں کیا گیا۔ جب تک ہزاروں خواتین نے احتجاج کی صورت میں اسمبلی چیمبر تک مارچ نہیں کیا۔ خواتین ارکان اسمبلی کی خواتین کو عوامی سطح پر متحرک کرنے کی قابلیت نے، ویسٹ پنجاب مسلم پرسنل لاء (شریعت) اپیلی کیشن ایکٹ 1948ء (ix آف 1948ء) کا راستہ ہموار کیا، جس نے خواتین کے جائیداد کی وراثت میں حق بشمول زرعی اراضی کا تسلیم کیا۔

سیاسی میدان سے باہر بھی خواتین نے تحریک پاکستان کی حمایت کیلئے متحرک کرنے کی طرح، اسی ہمت اور قائدانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ پاکستان قائم ہونے کے نتیجہ میں مہاجرین کے اُمنڈ آنے والے سیلاب کے دوران، خواتین وحضرات، دونوں نے بے گھر ہونے والے لوگوں کی بحالی میں مدد کی۔ یہاں پاکستان کے پہلے وزیراعظم کی بیوی، بیگم رعنا لیاقت علی خان کی قیادت میں بنائی گئی ویمنز والینٹری سروس (W.V.S) خصوصی تذکرے کی مستحق ہے۔ اس تنظیم کا ایک واضح مقصد یہ تھا کہ اس کو سیاسی ڈھانچے سے باہر

رہتے ہوئے خواتین کو سرگرم عمل رکھنا اور اس میں کم آمدنی والی خواتین کو شامل کرنا تھا۔

بیگم لیاقت علی کی ایک اور تجویز، جو پاکستان وومن نیشنل گارڈ اور پاکستان وومن نیول ریزروک متعارف کرانے کے بارے میں تھی، اس کی **1949ء** میں شدید مخالفت کی گئی۔ خواتین کے تربیت یافتہ دستہ نے جو معاشی مہارت بھی رکھتا ہو، کے نظریہ کا بھی خوف ودہشت کے لحاظ سے تجزیہ کیا گیا اور دوستوں پر، بعض پر جوش مذہبی گروہوں نے غیر اخلاقی اور بری عادات کے اڈوں کا، الزام لگایا اور **1954ء** میں دونوں کو بعض قدامت پسند عناصر خاص طور پر مولویوں (مسلمان مبلغ) کی شدید مخالفت کی وجہ سے سبکدوش کر دیا گیا۔

1949ء میں ویمنز والینٹری سروس کی ایک شاخ بنی، آل پاکستان وومنز ایسوسی ایشن، آل پاکستان وومن ایسوسی ایشن (اپوا) نے تعلیمی، سماجی اور معاشی آگاہی کے پروگرام ترتیب دیئے اور ان پر کام کیا۔ غیر سیاسی ہونے کی وجہ سے اپوا کو ایک دھمکی کی حیثیت سے نہ دیکھا گیا اور حکومت نے اس کی مکمل ترجمانی کی۔ تاہم اپوا نے اپنی اصلاحی کارروائیوں کے علاوہ خواتین کو شادی میں تحفظ مہیا کرنے کیلئے قوانین بنانے میں بھی کردار ادا کیا اور کثیر الازدواجی کے خلاف لابنگ کی ایک اور غیر سیاسی غیر سرکاری تنظیم ''بزنس اینڈ پروفیشنل وومنز کلب''، تھی جس نے **1954ء** میں آمدنی پیدا کرنے والے مسائل پر توجہ دی۔

اس کے برعکس انجمن جمہوریت پسند خواتین یا ڈیموکریٹک وومنز ایسوسی ایشن، جو **1948ء** میں قائم ہوئی تھی، کا ایک واضح سیاسی ایجنڈ تھا۔ اس نے مارکس کے نظریہ کی بنیاد پر کارخانوں، ریلوے اور فشریز میں کام کرنے والی خواتین کارکنوں کی ترقی کیلئے کام کیا۔ اس نے ان کیلئے مساوی تنخواہ، مہارت کی تربیت اور ٹرانسپورٹ سہولتوں اور خواتین کیلئے، ہاسٹلز اور بچے پرورش کرنے کے مراکز کا بھی مطالبہ کیا۔

1955ء میں برسر اقتدار وزیر اعظم کی دوسری شادی نے خواتین کو کثیر الازدواجی کے خلاف احتجاجی تحریک کیلئے بھڑکایا، جس کی وجہ سے حکومت نے رشید کمیشن مقرر کیا جس کا کام فیملی لاءز پر نظر ثانی کرنا تھا، اس کے چھ سال بعد ایوب خان کے مارشل لاء کے دور میں

فیملی لائز آرڈیننس آف 1961ء کا نفاذ ہوا۔ اس آرڈیننس نے شادیوں اور ان کے خاتمہ کو ترتیب دیا۔ طلاق تفویض (بیوی کا طلاق دینے کا حق) کا تعارف کرایا۔ باہمی رضامندی سے شادی ختم کرنے کی وجوہات کو وسیع کیا اور بیوی سے دوسری شادی کیلئے پہلے اجازت حاصل کرنے اور یہ اجازت حاصل نہ کرنے کی صورت میں شادی کے قانونی خاتمہ کی راہ کھول کر کثیر الازدواجی راستہ روکا۔

ایوب خان کے دورِ حکومت (1958ء تا 1968ء) میں قائم ہونے والی اکثر غیر سرکاری تنظیمیں شہری تھیں اور ان کی اکثریت کی بنیاد اصلاحی تھی۔ اپوا اور بعد ازاں بہبود، سماجی اصلاح کے منظر میں چھا گئیں۔ جنوری 1967ء کا ''سراپٹومسٹ کلب'' قدرے مختلف تھا اور اس میں تعلیم، پیشہ وارانہ تربیت اور خواتین کیلئے ذرائع معاش پر سیمینار ترتیب دینے پر توجہ دی گئی تھی۔

1971ء سے 1977ء۔ خواتین کیلئے ہیجان انگیز، 1971ء سے 1977ء تک کا ذوالفقار علی بھٹو کا دور خواتین کیلئے ترقی کا زمانہ تھا، ذوالفقار علی بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی نے خواتین کی وسیع سیاست کو فروغ دیا۔ بیگم نسیم جہاں، جو پی پی پی کے بانی ارکان میں سے ہے، نے پارٹی کا پیغام لاہور میں ہر محلّہ میں پہنچانے کیلئے تعلیم یافتہ خواتین کو متحرک کیا۔ جب پاکستان پیپلز پارٹی نے صوبائی رابطوں کے ساتھ وومن ونگ قائم کیا تو خواتین کی سیاست کی زود اثری کو وسیع تر کیا۔

1972ء میں تمام سرکاری ملازمتیں خواتین کیلئے کھول دی گئیں۔ اور پہلی دفعہ خواتین کو صوبائی گورنر یونیورسٹی وائس چانسلر اور قومی اسمبلی کی ڈپٹی سپیکر تعینات کیا گیا۔

1975ء خواتین کا عالمی سال بڑی سرگرمی سے منایا گیا۔ میکسیکو کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی بیگم بھٹو نے کی تھی۔ جنہوں نے میکسیکو اور اعلامیہ پر دستخط کئے۔ بعد ازاں موقع کی نشاندہی کیلئے پاکستان وومنز انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا۔ جنوری 1976ء میں تیرہ رکنی خواتین کے حقوق کی کمیٹی بنائی گئی۔ جس کا کام خواتین کی سماجی، قانونی اور معاشرتی

حالتوں کو بہتر بنانے اور آسان بنانے کیلئے سفارشات مرتب کرنا تھا۔

بے شک خواتین ڈویژن بنانے کی سفارش کو 1972ء میں منظور کرلیا گیا، تاہم کمیٹی کی رپورٹ اور سفارشات کو بڑی حد تک نظر انداز کر دیا تھا۔ اس عرصہ کے دوران آل پاکستان وومن ایسوسی ایشن نے اپنا نقطۂ نگاہ ترقی کی طرف تبدیل کرلیا اور کئی دوسرے گروہ ظاہر ہوئے اور انہوں نے شہری اور دیہی خواتین کی ترقی کیلئے کوششیں کیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے ایجنڈے سے بے اطمینانی نے مختلف تنظیموں کو جنم دیا تاکہ وہ معاشرے کے مختلف طبقوں کیساتھ کام کریں۔ ٹریڈ یونین اور طلباء تنظیمیں بڑی تیزی سے قائم ہوئیں۔ جن میں سے پنجاب میں نیشنل سٹوڈنٹ آرگنائزیشن کا وومنز ونگ بڑا سرگرم تھا، اس نے باقاعدگی سے ایک خبرنامہ شائع کیا اور کم آمدنی والی خواتین تک پہنچنے کو مقصد بنالیا۔

اس وقت کی دوسری قابل ذکر خواتین کی تنظیموں میں یونائیٹڈ فرنٹ فار وومنز رائٹس (تنظیم نو) تھی۔ جس کا بنیادی مقصد خواتین رائے۔ دہندگان کی بنیاد پر خواتین کیلئے نشستوں کی آئین میں شامل کر کے محفوظ کرنا تھا۔ ''یونائیٹڈ فرنٹ فار وومنز رائٹس'' مختلف تنظیمیں ''وومنز فرنٹ''، ''عورت'' اور شرکت گاہ تھیں۔ وومن فرنٹ 1973ء سے 1974ء میں قائم ہوئی۔ جو پنجاب یونیورسٹی کی بائیں بازو کی طالبات پر مشتمل تھی۔ اس کا نعرہ ''خواتین اور سیاست ایک ہیں'' تھا اور اس کے پروگراموں میں معاشرے میں خواتین کی پوزیشن اور مقام پر مباحثہ جات، بحث و تمحیص، لیکچرز اور سیمینار شامل تھے۔ اس کی رکنیت میں تمام سماجی گروہوں کے لوگ شامل تھے اور یہ دوسری یونیورسٹیوں تک پھیل گئی۔ بدقسمتی سے جب بائیں گروپ کیمپس سے چلا گیا تو 1977ء میں سیاسی ماحول میں تبدیلی کے ساتھ اس تنظیم کو ختم کر دیا گیا۔

''عورت فاؤنڈیشن'' کو اسلام آباد میں 1976ء سے 1977ء میں یونیورسٹی کی آزاد خیال اساتذہ طلباء اور کارکن خواتین نے تشکیل دیا۔ کم آمدنی والی خواتین پر توجہ دی، اس کا سب سے اہم کام ایک خبرنامہ تھا۔ جس نے قانونی حقوق اور صحت کے متعلق

معاشرے میں آگاہی پیدا کی۔ 1981ء میں گروپ کے منتشر ہونے سے پہلے اس کے چھ شمارے شائع ہو چکے تھے۔

1975ء سے 1976ء میں قائم ہونے والی شرکت گاہ نے دونوں کو مات کر دیا اور 1981ء میں خواتین محاذ عمل (WAF) بنانے میں کردار ادا کیا، جو کئی سالوں سے پاکستانی خواتین کیلئے بنیادی سیاسی لابی ہے۔ شرکت گاہ کا ایجنڈا، شعور میں اضافہ کرنا اور خواتین کیلئے ترقی پروگراموں میں اضافہ کرنے کیلئے خواتین پر تحقیق (ریسرچ) کرنا تھا۔ اس کی غیر مذہبی اجتماعی کارگزاری کا انداز بے مثال تھا۔ اس نے اسلام آباد میں خواتین کارکنوں کیلئے ہوسٹل قائم کیا (بعد ازاں حکومت کے سماجی بہبود کے محکمہ کے حوالے کر دیا گیا) اور پاکستان میں پہلی دفعہ خواتین ''پرائیوٹینٹ ببلیوگرافی'' لکھی۔

1977ء سے 1988ء واپسی کا دور جولائی 1977ء کا ڈرامائی انقلاب جو جنرل ضیاء الحق کا مارشل لاء لایا۔ اس نے خواتین کے لئے دور واپسی کی منادی کرادی۔

ضیاء الحق کی فوجی ڈکٹیٹرشپ نے، بہت زیادہ مشتہر اسلامائزیشن مہم کے ذریعے طاقت کو اپنے پاس رکھنے کے، جواز کیلئے استعمال کیا۔ جبکہ اکثر اقدامات مظہری طور پر سطحی ہوتے تھے۔ معاشرے کے کچھ طبقوں کو قابل ذکر نقصان ہوا۔ خواتین، جو کہ سیاسی، سماجی اور معاشی لحاظ سے سب سے کمزور ہیں، کو خاص طور پر عورتوں کے ساتھ بہت برا بیتا۔ منفی قانون سازی اور حکم ناموں کے علاوہ، جنہوں نے خواتین کے مقام کی جڑیں کھوکھلی کیں، ضیاء کی حکومت نے خواتین کا شعبہ قائم کیا۔ بدقسمتی سے وومنز ڈویژن کی استعداد کار، جو اصولی طور پر وسیع مینڈیٹ رکھتی تھی۔ کو صوبائی سیکرٹریٹ کی سطح سے نیچے انتظامی ڈھانچے کی کمی کی وجہ سے شدید کم کر دیا گیا۔ حیران کن طور پر 1984ء میں حکومت نے سٹیٹس آف وومن پر ایک کمیشن قائم کر دیا جو تیرہ خواتین اور تین مردوں پر مشتمل تھا۔ جس نے 1985ء میں معاملات کی حالت کو ناکارہ قرار دینے والی رپورٹ جمع کروائی۔

حدود آرڈیننس 1979ء اور قانون شہادت 1984ء ایسے ظالمانہ قوانین کو

آئینی کتاب میں لایا گیا۔ دوسروں کی تجاویز پیش کی گئیں۔

اور عوامی زندگی میں خواتین کی شمولیت کو روکنے کیلئے ہدایات جاری کی گئیں۔ ظاہری طور پر تیزی کے ساتھ تذکیر وتانیت کے مسائل اور امتیازی سلوک پر توجہ مرتکز کرتے ہوئے خواتین کے حقوق کی واپسی نے وسیع طور پر خواتین اور خواتین کے گروہوں کو عورتوں کے حقوق کی لابی بنانے کی ہمت دلائی۔ ستمبر 1981ء میں شرکت گاہ نے ہم خیال خواتین کی میٹنگ بلائی تاکہ جنرل ضیاء کے پہلے سالوں کے ظالمانہ حکم نامے اور تجاویز کے خلاف ترجیحات پر بحث کی جائے۔ خاص طور پر ''حدود آرڈیننسوں'' کی لپیٹ میں آنے والوں پر بحث کی گئی اس کے نتیجہ میں خواتین محاذ عمل یا انگریزی نام وومن ایکشن فورم قائم ہوا آنے والے برسوں میں خواتین محاذ عمل خواتین کے حقوق کا انتہائی سرگرم پریشر گروپ اور لابی رہا ہے۔''

سیاسی جماعتوں کے شعبۂ خواتین کا کردار

مسلمان خواتین کی اعلیٰ اور متوسط طبقوں میں تقسیم اور ان کی عملی طور پر عوامی اور عوامی میدان میں غیر موجودگی، ہمیشہ سے ان کی بیداری میں رکاوٹ ڈال رہی ہے، قبل از تقسیم انڈیا میں مسلم لیگ نے خواتین کی بیداری کا احساس کیا۔ اس نے ایک الگ خواتین کی کمیٹی اور بعد میں ان کی ایک طلبہ تنظیم بنائی۔ پارٹی میں ان خاص ساختوں نے اپنے علاقوں کی نصف تعداد یعنی خواتین کی بیداری کو اپنے سیاسی ایجنڈے میں ضروری مقصد بنایا اس لیے انہوں نے خواتین کیلئے خصوصیت کے ساتھ کوئی محاذ مہیا نہ کیا۔ جس پر وہ اپنے آپ کو سرگرم اور اپنا تجزیہ جنسی مسائل کے لحاظ سے کرسکتیں۔ مثلاً جب مردوں سے عورتوں کے پردہ کے رواج کو، انہوں نے پارٹی کیلئے خواتین کی واضح حمایت حاصل کرنے میں رکاوٹ محسوس کی تو ان رکاوٹوں کو دور کرنے کی بجائے ناکام بنا دیا گیا۔ باین ہمہ جہاں آرا شاہ نواز کو نہ صرف خواتین کی نمائندہ تصور کیا گیا اور اسے مسلم لیگ کی مرکزی کمیٹی میں آنے کی دعوت دی

جو پارٹی کے فیصلے کرنے والی کمیٹی ہے۔

1970ء کی دہائی میں پاکستان پیپلز پارٹی نے خواتین کمیٹی کو وومنز ونگ کا نام دیا اور مستقبل بنیادوں پر دیہاتی خواتین کو قائدانہ سطح پر بیدار کرنے اور شامل کرنے کا ارادہ کیا۔ اس نظام کو کئی دوسری جماعتوں نے اختیار کیا۔ یعنی پرانی پارٹیوں، مسلم لیگ اور نئی سندھ عوامی تحریک اور مہاجر قومی موومنٹ نے بھی اس کو اختیار کیا۔

وومنز کمیٹی اور بعد ازاں وومنز ونگ، اگر خواتین کو سیاست میں شریک کرنے کیلئے ان کی مدد کرتیں، تو دودھاری تلوار کا کام دے سکتی تھیں۔ اس نے دہری تشریح کا کردار ادا کیا۔ پہلے تو اس نے خواتین سیاستدانوں کو پارٹی میں ان شعبوں (ونگز) تک محدود کر دیا اور دوسرے تذکیر وثانیت کے مسائل کو بھی ان ونگز کی طرف منتقل کر دیا۔ جہاں اکثر خواتین کے مسائل پر توجہ مرتکز نہ کی گئی۔ عوامی نیشنل پارٹی اور تحریک استقلال ایسی پارٹیاں جن کے وومنز ونگ نہیں تھے۔ ان پارٹیوں نے مقابلتاً جلدی خواتین کو عام نشستوں کیلئے امیدوار نامزد کیا۔ اور سب سے نئی سیاسی پارٹیوں، سندھ عوامی تحریک اور ایم کیو ایم کے خواتین ونگ دلچسپی کا باعث ہیں۔

دونوں پارٹیاں 1980ء کے عشرے میں نسلی ولسانی سیاست کے سرگرم کے طور پر معرضِ وجود میں آئی ہیں۔ جنہوں نے صوبہ سندھ کی نمائندگی کی ہے۔ دونوں کے سرگرم وومنز ونگ ہیں، جنہوں نے اپنی اپنی متعلقہ پارٹیوں کے سیاسی ایجنڈا میں کردار ادا کیا ہے۔ عوام کو ترقی کے مفادات حاصل کرنے کے لئے کام کیا ہے۔

ایم کیو ایم کا وومن ونگ 1986ء میں آغاز سے ہی قائم ہو گیا تھا۔ ایم کیو ایم کو وومن ونگ 1987ء کے بلدیاتی الیکشن میں ووٹ اکٹھے کرنے اور ایم کیو ایم کیلئے حمایت حاصل کرنے میں فیصلہ کن ثابت ہوا جو کراچی اور حیدر آباد میں سارا الیکشن جیت گیا۔ ان دونوں شہروں میں ایم کیو ایم کی فتح وومن ونگ اور مردوں کی بیداری کا مساوی نتیجہ تھی۔ جولائی 1988ء میں ایم کیو ایم کی خواتین نے ایک بڑی ریلی منعقد کی۔ جس نے ان کی

تنظیمی اہلیت اور سندھ کی کلاشنکوف سیاست میں آنے کی تیاری کا مظاہرہ کیا۔

ایم کیو ایم کے وومن ونگ کے متعلق معلومات حاصل کرنا مشکل ہے۔ بار بار مسائل پر بحث ومباحثہ اور خواتین کے برخلاف قوانین کی مخالفت کی گئی، لیکن ان کا خواتین کے دوسرے گروہوں کے ساتھ رابطہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

یہ معلوم ہے کہ تمام شعبہ ہائے زندگی سے خواتین کی نمائندگی ہوتی ہے لیکن مذہبی پیشواؤں کے قریب تر اور سخت گیر ایم کیو ایم کا وومن ونگ جو سختی کے ساتھ پارٹی کے نظم وضبط میں محدود رہ کر کام کرتا ہے۔ اس کے کوئی خود مختار پروگرام نہیں ہیں اور اس کا بیرونی قوتوں سے رابطہ (اگر ہے) کم سے کم ہے۔ یہ مرکزی پارٹی کیلئے امدادی کردار ادا کرتا ہے۔

اس کے برعکس سندھیانی تحریک (عوامی تحریک) کا کام کرنے کا انداز کافی حد تک خود مختار ہے اور اس نے دانستہ دوسرے خواتین گروہوں سے تعلقات بنائے اور مضبوط کئے ہیں۔ سندھیانی تحریک نے اس کے علاوہ کامیابی سے خواتین کو بیدار کیا ہے جو اب تک پردہ میں رہی تھیں۔ تاہم آخر کار سندھیانی تحریک، عوامی تحریک اور اس کے قائد رسول بخش پلیجو کی تابعدار ہیں، سندھیانی تحریک کی خواتین نے جنگ جوئی کو شامل کرلیا ہے۔ جو سندھی سیاسی کلچر کا ایک حصہ بن گئی ہے۔ اور اسی طرح باقی ملک کا بھی۔ 1989ء میں پلیجو کی سالگرہ کے موقع پر سندھیانی تحریک کی خواتین نے کلاشنکوفوں کے ساتھ مارچ کیا تھا۔

اس لیے سیاسی عمل میں وومن ونگز زیادہ تر بیداری کا ایک ذریعہ رہے ہیں۔ جو سیاسی جماعتیں خواتین کو ان کی حمایت کی بنیادوں پر استعمال کرتی رہی ہیں۔ جماعتوں کے سیاسی ایجنڈوں پر وومنز ونگز کی کاروائیوں کا کافی واضح اثر نہیں پڑا (یا معمولی)۔ جن کے سامنے، پارٹی میں اختیارات نہ ہونے کی وجہ سے، روڑے اٹکائے گئے ہیں اور جہاں انہیں کوئی اختیار تھا، وہاں سخت مذہبی لوگوں نے روڑے اٹکائے۔ محترمہ نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو، جنہوں نے اپنے شوہر اور باپ کی وجہ سے سیاست میں جگہ پائی۔ نسیم ولی خان، جو اس وقت سیاست میں وارد ہوئی۔ جب اُن کے شوہر ولی خان 1976ء سے 1977ء میں غداری

کے مقدمہ میں حیدر آباد جیل میں تھے۔ ولی خان نے بذاتِ خود سیاست، اپنے باپ خان عبدالغفار خان سے وراثت میں حاصل کی تھی)۔

یہ 1980ء کا عشرہ ہی ہے کہ غیر سیاسی خاندانوں سے کچھ متوسط طبقے کی خواتین سیاسی منظر پر جلوہ افروز ہوئیں۔ جس میں خاص طور پر تحریک استقلال میں خواتین نے غیر معمولی سرگرمی دکھائی۔ 1988ء کے جنرل الیکشن میں 4 خواتین کو جنرل الیکشن لڑنے کیلئے ٹکٹ بھی ملے۔ تاہم اس قسم کی خواتین سیاستدانوں کی معاشی حالات کا پس منظر ان کے الیکشن جیتنے میں کام نہ آسکا۔

☆☆☆☆☆

''ملک کی ترقی عورتوں کے تحفظ سے مشروط ہے''

پاکستان میں تشدد اور دہشت گردی کے واقعات اتنے بڑھ گئے ہیں کہ شہریوں کو عدمِ تحفظ کا بے حد احساس ہو رہا ہے۔

عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ دوہرا عدم تحفظ کا احساس ہو رہا ہے اور اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے جیسے گھر سے باہر جنسی خوف و ہراس ۔ سڑکوں ، بسوں میں عورتوں پر فقرے بازی اور جسمانی چھیڑ خانی کرنا، ملازمت کی جگہ پر جنسی طور پر ہراساں کرنا۔ عورتوں کی سرِ عام بے حُرمتی اور خاندانی دُشمنی کا انتقام لینے کے لئے عورتوں سے زیادتی کرنا، تشدد کرنا، رسم ورواج کا سہارا لے کر عورتوں کو قتل کرنا مثلاً کاروکاری اور سیاہ کاری ، مردوں کے کئے ہوئے جرم کی سزا اُن کے خاندان کی لڑکیوں کو ونی اور سوارہ کر کے کم عمر بچیوں کی شادی بڑی عمر کے مرد سے کرنا۔

غرض سماجی تشدد کی یہ مختلف شکلیں پورے معاشرے کی سطح پر عورتوں اور لڑکیوں کو خوف و ہراس میں مبتلا رکھتی ہوتی شکلیں ہیں جس سے ان میں عدمِ تحفظ کا احساس شدت سے بڑھ رہا ہے۔

عورتوں کے خاندان والے ان کے گھروں سے باہر نکلنے سے ، خصوصاً کسی

دوسرے شہر میں تعلیم یا نوکری کرنے کے لئے بھیجنے سے گھبراتے ہیں۔ عام طور پر وہ صحت اور تعلیم کی بنیادی سہولتوں تک رسائی سے بھی محروم ہو جاتی ہیں۔ ملازمت اور تربیت کے مواقع بھی اس پابندی کی وجہ سے کھو بیٹھتی ہیں۔ وہ معاشرے کی سرگرمیوں میں آزادی سے حصہ نہیں لے سکتیں اور بہت سا اہم تجربہ بھی حاصل نہیں کر پاتی ہیں۔ یہ کمی آگے جا کر اُن کی ترقی میں حائل ہوتی ہے۔ مثلاً نوکری کے بہت سے مواقع پا کر یا نوکری میں ترقی کے مواقع یا عہدے ان کو نہیں ملتے کیونکہ مردوں کے برعکس اُن کا تجربہ زیادہ نہیں ہوتا۔

''پچھلی حکومت نے عورتوں کے حقوق برابری اور با اختیار بنانے کے لئے بہت کام کیا جیسے حدود آرڈیننس کے اندر تبدیلی لا کر اس قانون کو عورتوں کے خلاف استعمال کرنے سے روکا گیا۔ غیرت کے نام پر عورتوں کو قتل کرنے یعنی کاروکاری یا سیاہ کاری کرنے والے گھر کے افراد کو قتل عمد کی سزا کا قانون۔ تحریک نسواں بل وغیرہ پر پہلی دفعہ سیاسی طور پر عورتوں کو لوکل باڈی میں 33 فیصد صوبائی، قومی اور سینٹ میں 17 نمائندگی دے کر عورتوں کو ملکی معاملات میں شرکت اور فیصلہ سازی میں شرکت کا موقع فراہم کیا''۔

گورنمنٹ کے اداروں میں ملازمت کے لئے عورتوں کا 10 فیصد کوٹہ مقرر کیا۔ عورتوں کے لئے شیلٹر ہوم اور کرائسز سینٹر ہر ضلع میں کھولے۔ دیہات کی عورت کو اقتصادی طور پر با اختیار بنانے کے لئے جفاکش پروگرام شروع کیا۔ چھوٹے قرضوں کے پروگرام کے ذریعہ عورتوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے مواقع مہیا کئے مگر ان کاموں نے بھی عورتوں کو تشدد سے پاک معاشرہ نہیں دیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ 21ویں صدی میں بھی پاکستان کا معاشرہ 18ویں صدی میں جی رہا ہے۔ پاکستان میں جاگیردارانہ ذہنیت، مذہبی انتہا پسندی اور قبائلی رسم و رواج عورت کو مرد کی ملکیت سمجھتا ہے،

ایک انسان نہیں، جب تک یہ سوچ تبدیل نہیں ہوگی، ہمارا معاشرہ عورتوں کو برابر کا حق دینے کو کبھی تیار نہیں ہوگا۔

ہمارا مذہب بھی نہ صرف یہ کہ عورت کا احترام سکھاتا ہے بلکہ عورت اور مرد کے درمیان کسی قسم کا امتیاز نہیں پیدا کرتا۔

''قائداعظمؒ کا فرمان ہے کہ عورتوں کو مردوں کے شانہ بشانہ ملک کی ترقی میں حصہ لینا چاہئیے۔ 1973ء کا آئین عورت اور مردوں کو برابری کا حق دیتا ہے جس کی بنیاد پر کوئی قانون امتیازی نہیں ہوسکتا''۔

مگر عموماً دیکھا یہی گیا ہے کہ مذہبی انتہا پسند گروہ، جاگیردار اور قبائل مل کر عورت کو تعلیم نہ دے کر، اس کی صحت کا خیال نہ کر کے، رسم ورواج کی بھینٹ چڑھا کر، گھریلو تشدد، قرآن سے شادی، ونی، سوارہ کی رسم، وٹہ سٹہ کی شادی وغیرہ کر کے، کوڑے مارتے ہیں، غیرت کے نام پر قتل کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔

اسی لئے اس سال کے ابتدائی تین ماہ کے دوران پاکستان میں ہزاروں عورتوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ مگر افسوس ہمارا معاشرہ یا تو اس کو تشدد نہیں سمجھتا اور اگر سمجھتا بھی ہے تو خاموشی سے اسے نظرِ انداز کر دیتا ہے۔

خواتین پر ذہنی اور جسمانی اور معاشرتی دباؤ اور تشدد کی وجہ سے آدھی آبادی، معاشی خوشحالی، معاشرتی ترقی میں شرکت سے محروم ہو جاتی ہے۔ لیکن صرف انسانی حقوق کے لئے کام کرنے والی تنظیمیں ہی اس کے خلاف آواز بلند کرتی ہیں۔ دُکھ تو یہ ہے کہ ہمارے ملک کی کسی سیاسی جماعت کے منشور یا ایجنڈے میں اس ظلم کے خلاف کچھ نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ سیاسی نمائندے نمائشی دوروں، جذباتی تقریروں اور وعدوں کے علاوہ کوئی بامعنی قدم اُٹھانے کے لئے تیار ہیں۔ کسی بھی پارٹی کی ترجیحات میں عورتوں کے خلاف تشدد ان

کے حقوق کا تحفظ شامل نہیں ہوتا۔ درجنوں وزیروں میں پنجاب اور وفاق کی حکومتوں کو خواتین کی الگ وزارت کے لئے کوئی وزیر نامزد کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی اس سے ان کی سنجیدگی کا پتہ چلتا ہے۔

قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ ''کوئی جنگ یا کوئی ترقی اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک خواتین اُس میں شامل نہ ہوں۔''

''عورت کو حق دنیا دراصل سماج کو حق دینا ہے۔ تشدد سے پاک معاشرہ کی ضرورت آج پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ نواب پور کی بٹیاں بھرے بازار میں عریاں کر کے نچوائی گئیں۔ بلوچستان میں ان کو زندہ درگور کر دیا گیا۔ کاروکاری اور سیاہ کاری کے نام پر ہر سال سینکڑوں لڑکیوں کو مار دیا جاتا ہے ظالم لوگوں نے بھوکے کتوں سے ایک لڑکی کو اپنی پسند کی شادی کرنے پر نچوائی گئی اور گولیاں مار کر ہلاک کر دیا''۔

قبائلی علاقوں، سوات، مالاکنڈ اور دیر کے علاقوں میں اُن کے سینکڑوں اسکولوں کو اس نے تباہ کر دیا کہ وہ پڑھ لکھ کر باشعور نہ ہو جائیں اپنے حقوق جو اُن کو انکے مذہب اور ان کے ملک نے دیئے ہیں اُس کو حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں۔

☆☆☆☆☆

انتہا پسندی کے سایہ میں ترقی؟

تحریک نفاذ شریعت محمدی کے سربراہ مولانا صوفی محمد اور عوامی نیشنل پارٹی کے درمیان امن معاہدہ یا ''نظام عدل'' ریگولیشن ایک ایسے وقت ہوا جب سوات اور مالاکنڈ ڈویژن کا پورا علاقہ جنگ کی لپیٹ میں تھا۔ مقامی لوگوں نے یہ سوچ کر اس معاہدہ کو خوش دلی سے منظور کر لیا کہ اس سے علاقہ میں دوبارہ امن قائم ہو جائے گا لیکن معاہدے کے بعد جو صورت حال سامنے آ رہی ہے وہ کوئی زیادہ خوش کن نہیں بلکہ جو صورت حال بن رہی ہے، اس نے اُن طبقات کے خدشات کو تقویت دی ہیے کہ یہ معاشرہ سوات تک محدود نہیں رہے گا اور دوسرے یہ کہ اس معاہدے کو بنیاد بنا کر لوگوں کے بنیادی حقوق کو سلب کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس کی پہلی مثال سامنے آ گئی، جس میں ایک خاتوں پر ایک ہجوم کے سامنے اذیت ناک تشدد کیا اور اُس کی عزت نفس کی مجرمانہ پامالی کی گئی۔ طالبان نہ تو عدالتی اختیار رکھتے ہیں نہ کسی شہری پر اپنی مرضی کا اسلام نافذ کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ مولانا صوفی محمد اور اُن کے حامیوں نے سوات میں ایک عوامی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے ملک کی تمام عدالتوں کو غیر شرعی قرار دیا اور کہا کہ جو لوگ ان عدالتوں میں پیش ہونگے وہ اسلام کی مخالفت کے مرتکب ہوں گے۔ اُنہوں نے جمہوریت کو غیر اسلامی نظام قرار دیتے ہوئے مطالبہ کیا

کہ شریعت کا نفاذ صرف سوات میں نہیں بلکہ پورے ملک میں کیا جائے۔ اُن کے بقول جج، سیاست دان، جمہوریت، وکلاء سب اسلام کے باغی ہیں۔ اسمبلیاں اور سپریم کورٹ، ہائی کورٹ، حرام ہیں۔ یہ وہی سپریم کورٹ ہے جس نے مولانا صوفی محمد کو ضمانت دی تھی۔ یہ وہی پارلیمنٹ ہے جس نے ''نظام عدل'' ریگولیشن کی حمایت کی تھی۔ یہ بھی دیکھنے کی بات ہے کہ جیسے ہی ''نظام عدل'' ریگولیشن کی منظوری ہوئی اس کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے طالبان کسی قابل ذکر مزاحمت کے بغیر بونیر میں داخل ہو گئے۔ جبکہ اس معاہدے میں یہ کہا گیا تھا کہ کوئی شخص اسلحہ اُٹھا کر سڑکوں پر نہیں گھومے گا۔ جس وقت طالبان بونیر کی گلیوں میں آزادانہ گشت کر رہے تھے اُسی وقت اُن کے ایک ساتھی مولانا عبدالعزیز کی رہائی ہوگئی۔ ایک غیر ملکی خبر رساں ادارے سے بات کرتے ہوئے تحریک طالبان سوات کے ترجمان مسلم خان نے مولانا عبدالعزیز کی رہائی کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ مالاکنڈ ڈویژن میں نظام عدل ریگولیشن کے نفاذ میں لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے طلباء طالبات کی کوششیں بھی شامل ہیں۔ رہائی کے بعد لال مسجد میں اپنا پہلا خطبہ دیتے ہوئے مولانا عبدالعزیز نے مسلم خان سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقع پر اُنہوں نے پورے ملک میں بلکہ پوری دنیا میں شریعت کے نفاذ کی جدوجہد جاری رکھنے کا اعلان کیا۔ تحریک نفاذ شریعت محمدی اور لال مسجد کے درمیان قربت اور فکری ہم آہنگی اب ڈھکی چھپی بات نہیں۔ مولانا عبدالعزیز کے بیانات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ آنے والے دنوں میں ایک بار لال مسجد کے طلباو طالبات اور حامی دوبارہ انہی سرگرمیوں میں ملوث ہو جائیں گے جو کہ جو لائی 2007ء میں تھیں۔ تشویش کی بات یہ ہے کہ اسلام آباد کے علاقہ میں مدرسہ حفصہ بنانے کے لیے زمین دی جا رہی ہے تو مدرسہ اور لال مسجد دوبارہ اُنہی سرگرمیوں میں ملوث نہ ہو جائے جو تصادم اور کشت وخون کا باعث بنے۔ حکومت پاکستان اور امن وامان قائم رکھنے والے اداروں کا یہ فرض ہے کہ وہ نظر رکھیں کہ دوبارہ ان اداروں میں اسلحہ جمع نہ ہونا شروع ہو جائے۔ ایسی کسی صورتحال میں فوری کارروائی کریں کیونکہ موجودہ حالات میں کہ جب یہ

ثابت ہو چکا ہے کہ لال مسجد اور تحریک طالبان کا تعلق بہت قریب کا ہے، اس وقت جب کہ ملک انتہا پسندوں کی بڑھتی ہوئی شورش کی وجہ سے بدترین بحران کا شکار ہو چکا ہے، معمولی غفلت بھی کسی بڑے سانحے کو جنم دی سکتی ہے۔ یہ ادارے ماضی میں ہونے والی غفلت کا خمیازہ پہلے ہی بھگت چکے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ عوام کو آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ لال مسجد کے طلبا و طالبات کے پاس اتنی بڑی مقدار میں ہتھیار پہنچے کیسے۔

ان تمام حالات کو سامنے رکھتے ہوئے حکومتوں کے علاوہ کیا عوام کا بھی کوئی رول ہے کہ نہیں۔۔۔؟ اب وقت آ گیا ہے کہ ہمیں ان انتہا پسندوں اور دہشت گردوں کے خلاف عوام کو باشعور کرنا ہوگا۔ ہمیں اس ملک کو قائداعظمؒ کا پاکستان بنانا ہیے نہ کہ ان انتہا پسندوں کا پاکستان جن کی نظر میں لڑکیوں کی تعلیم حرام، سپریم کورٹ، ہائی کورٹ حرام ہیں۔ عورتوں کا گھروں سے باہر نکلنا حرام، کام کرنا حرام جبکہ قائداعظمؒ کا فرمان تھا کہ پاکستان کی ترقی میں عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ کام کریں گی۔ اُنہوں نے اسلامیہ کالج میں لڑکیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ عورتوں کو چار دیواری میں بند رکھنا جرم ہے۔ 21ویں صدی میں پاکستان کو ایک جدید اسلامی جمہوری اور فلاحی مملکت بنانا ہے جس کے لیے ہر فرد کو تعلیم کی ضرورت ہے۔ پاکستان کو ایک پُر امن ملک بنانا ہے تا کہ ہم ''گلوبلآئزیشن'' کا حصہ بن سکیں۔ قائداعظمؒ کے پاکستان کو ہمیں ترقی یافتہ ملکوں کی صفوں میں کھڑا کرنے کے لیے اپنے بچوں کو علم کی روشنی دینے کے لیے اپنے نوجوانوں کو ملازمتیں دینے کے لیے پاکستان کو پھر ایک بار امن کا گہوارہ بنانا ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان کی تمام سیاسی جماعتوں نے ابھی تک ان مسائل پر جامع حکمت عملی وضع نہیں کی۔ اگر ہماری سیاسی قوتوں نے اپنے منشور میں انتہا پسندی اور دہشت گردی کے خاتمہ کے خلاف لڑنے کی بات نہ کی، ملک پر منڈلاتے خطرے کے لیے عوام کی رہنمائی کا فریضہ انجام نہ دیا تو تاریخ اُنہیں ایک مجرم کے طور پر یاد رکھے گی۔

☆☆☆☆☆

''تعمیر پاکستان میں خواتین کا کردار''

برصغیر میں صدیوں بادشاہت اور جاگیردارانہ معاشرہ کا چلن رہا ہے۔ یہ معاشرہ صدیوں پرانے ہندو دورِ حکومت میں بھی قائم رہا۔ جب مسلمان 712ء میں ہندوستان کی مذہبی، سماجی، معاشی اور معاشرتی زندگی میں ایک نئے عنصر کی حیثیت سے داخل ہوئے تو بھی معاشرہ پر سے جاگیرداری کی گرفت ڈھیلی نہ ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ برصغیر میں مسلمانوں کی باقاعدہ حکمران کی حیثیت سے آمد اُس بادشاہت پر قائم رہی یہاں تک کہ جب انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کرلیا تو اُنہوں نے اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لیے انہی جاگیرداروں کو استعمال کیا۔

جاگیردارانہ معاشرہ اور سخت قبائلی نظام کی سب سی بڑی بُرائی یہ ہوتی ہے کہ یہ ایک مخصوص سوچ کا حامل ہوتا ہے جس کے اندر کسی انقلابی سوچ یا نئے اندازِ فکر کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ وہ عوام الناس کو اپنا غلام سمجھتے ہیں اور ان کی جان و مال بلکہ عزت و آبرو پر تصرف کو بھی اپنا استحقاق تصور کرتے ہیں۔ جبر پر مبنی اس نظام کی بقاء کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ لوگ ان کے سامنے محض کیڑے مکوڑوں کی طرح زندگی بسر کریں اور کبھی سر اُٹھانے کی جرأت نہ کریں۔ جاگیرداری نظام میں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت انہیں

علم کی روشنی سے محروم رکھا جاتا ہے تا کہ وہ ساری زندگی اپنے نام نہاد آقاؤں کے دست نگر بنے رہیں۔ اس جاگیر دارانہ سوچ یعنی "Feudal Mentality" کی سب سے زیادہ زَد خواتین پر پڑتی ہے کیونکہ اس سوچ کے حامل معاشرے میں اُنہیں ناقص العقل سمجھا جاتا ہے اور اُن سے اُن کی زندگی کے اہم ترین فیصلے مثلاً شادی بیاہ، بچوں کی تعداد اور اولاد کے رشتے طے کرتے وقت رائے لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی ۔ المختصر انہیں معاشرے کا عضو معطل بنا کر رکھا جاتا ہے۔ برصغیر کی مسلمان خواتین کی اکثریت کو ایسے ہی حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد بحیثیت قوم مسلمانوں کو سیاست، معاشرت اور معیشت کے ضمن میں جس ابتر صورتحال کا سامنا کرنا پڑا، اس سے خواتین کا متاثر ہونا لازمی امر تھا۔ 1857ء کے بعد چار دہائیوں میں مسلمان قوم کی پسماندگی انتہا پر پہنچ گئی تاہم اس دوران سرسید احمد خان کی علی گڑھ تحریک اور علامہ محمد اقبالؒ کی انقلابی شاعری سے متاثر ہو کر مسلمان خواتین میں اپنی حالت بدلنے کا شعور بیدار ہوا۔ لہٰذا پنجاب، بنگال اور دیگر صوبوں میں طالبات کے لیے متعدد تعلیمی ادارے قائم ہوئے لیکن بحیثیت مجموعی مردوں کے مقابلے میں خواتین ہر شعبے میں بہت پیچھے رہ گئیں۔

برصغیر کی مسلمان خواتین کی حالتِ زار میں بنیادی تبدیلی تحریک پاکستان کی بدولت پیدا ہوئی۔ دراصل تحریک پاکستان ایک ایسی ہمہ جہت تحریک تھی جس نے صدیوں سے پسی ہوئی مسلمان خواتین کو بھرپور انداز میں مردوں کے شانہ بشانہ لا کھڑا کیا اور اس میں سب سے زیادہ اہم کردار حضرتِ قائداعظمؒ کا تھا۔ قائداعظمؒ نے مسلم لیگ کی صدارت سنبھالنے سے پہلے اور بعد میں بھی اپنی ہمشیرہ مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ کو ہر مرحلہ پر اور ہر تقریب میں اپنے ساتھ رکھا اور ان کی اس طرح سیاسی تربیت کی کہ وہ نہ صرف تحریک

پاکستان کے دوران ویمن مسلم لیگ اور خواتین وطالبات کی دیگر تنظیموں کی سر پرست بنیں بلکہ قیام پاکستان کے بعد بھی بیداری نسواں کی علامت بن گئیں ۔تحریک پاکستان کے دوران 17 اپریل 1946ء کو مسلم کنونشن دہلی سے خطاب کرتے ہوئے ''حضرت قائد اعظمؒ'' نے مسلمان برصغیر کو باور کرایا تھا کہ:

''دنیا میں کوئی قوم اُس وقت تک ترقی نہیں کرسکتی جب تک اس قوم کو مردوں کے شانہ بشانہ عورتیں بھی آگے نہ بڑھیں۔''

حضرت قائداعظمؒ اس امر کے داعی تھے کہ تحریک پاکستان کے دوران اور قیام پاکستان کے بعد تعمیر پاکستان میں بھی عورتوں کو مردوں کے مساوی کردار ادا کرنا ہوگا۔ریڈیو پاکستان ''ڈھاکہ سے 28 مارچ 1948 کو خطاب کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:

''قوم کی تعمیر اور اس کے استحکام کے عظیم کٹھن کام کے سلسلے میں خواتین کو انتہائی اہم کردار ادا کرنا ہے ۔ خواتین قوم کے نوجوانوں کے کردار کی معمار ہوتی ہیں جو مملکت کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ حصولِ پاکستان کی طویل جدوجہد میں مسلمان خواتین اپنے مردوں کے پیچھے مضبوطی سے ڈٹی رہی ہیں۔تعمیر پاکستان کی اُس سے بھی سخت اور بڑی جدوجہد میں، جس کا ہمیں اب سامنا ہے، یہ نہ کہا جائے کہ پاکستان کی خواتین پیچھے رہ گئیں یا اپنا فرض ادا کرنے سے قاصر رہیں۔''

خواتین وحضرات!

پاکستانی خواتین کے لیے مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ ایک رول ماڈل ہیں جنہوں

نے قیام پاکستان سے قبل انگریزوں اور ہندوؤں کی سازشوں کو ناکام بنانے کی خاطر برصغیر کے طول وعرض میں سفر کر کے مسلمان خواتین کو مسلم لیگ کے پروگرام سے آگاہ کیا اور اُنہیں اس کی حمایت پر آمادہ کیا۔ اگر ہم قومی زندگی میں فعال کردار ادا کرنا چاہتی ہیں تو ہمیں بھی مادرِ ملتؒ کی طرح ہی جرأت واستقامت کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ ویسی ہی جرأت واستقامت جو تحریک پاکستان میں برصغیر کی مسلمان خواتین کا طرۂ امتیاز تھی۔ کس کس کے نام گنوائے جائیں۔ بی امّاں، بیگم محمد علی جوہر، بیگم جہاں آراء شاہنواز، بیگم رعنا لیاقت علی خان، لیڈی نصرت عبداللہ، بیگم قاضی عیسیٰ، بیگم شائستہ اکرام اللہ، فاطمہ بیگم، بیگم نواب اسمٰعیل خان، لیڈی ہدایت اللہ، بیگم وقار النساء نون، بیگم زری سرفراز، بیگم سلمیٰ تصدق حسین .....اس کہکشاں کے ان گنت ستارے تھے جنہوں نے اپنی ضوپاشیوں سے تحریک آزادی کے در و بام کو منور کر دیا تھا اور جن کی خدمات کا اعتراف مسلمانان ہند کے نجات دہندہ حضرت قائداعظمؒ نے بارہا کیا تھا۔

1947ء میں آزادی حاصل کرنے سے قبل پچاس سالوں میں انڈیا میں مسلمان خواتین نے اپنی غیر مساویانہ صورتِ حال کی کایا پلٹنے کے لیے اپنے روایتی کردار کی حدود میں الگ تھلگ رہتے ہوئے بہت اہم پیش قدمی کی۔

1886ء میں پہلی بار ''محمڈن ایجوکیشن کانگرس'' میں برصغیر کی خواتین کے لیے جدید تعلیم اور معاشرتی مسائل پر بات کی گئی ..... 1908ء میں لاہور میں انجمن خواتین اسلام بنی جس میں خواتین کے سماجی، معاشی اور سیاسی حقوق کے تحفظ کی بات ہوئی ..... 1928ء میں خواتین کو ووٹ کا حق مل گیا۔

گورنمنٹ آف انڈیا کے ایکٹ 1935ء کے تحت چھیاسٹھ لاکھ خواتین کو حق رائے دہی ملا اور یہی نہیں بلکہ پہلی بار خواتین کو فیڈرل اسمبلی کی 250 میں سے 9 نشستیں اور کونسل آف سٹیٹ کی 150 میں سے 6 نشستیں الاٹ کی گئیں..... 1936ء اور 1937ء کے انتخابات میں صوبائی اور مرکزی پارلیمنٹ کے لیے 80 خواتین منتخب ہوئیں۔ ان میں

ایک خاتون وزیر، دو پارلیمانی سیکرٹریز، ایک ڈپٹی اسپیکر اور ایک ایوانِ بالا میں ڈپٹی پریذیڈنٹ لی گئیں۔

عالمی سطح پر اُس وقت انڈیا، روس اور امریکہ کے بعد خواتین ارکان اسمبلی کے لحاظ سے تیسرے نمبر آیا۔ مسلم خواتین کی نشستیں جداگانہ انتخابات کے ذریعہ پر کرنا تھیں۔ پنجاب اور بنگال میں ان کو صرف خواتین نے منتخب کرنا تھا..... 1946ء کے الیکشن میں بیگم جہاں آرا شاہنواز اور بیگم شائستہ اکرام اللہ مرکزی قانون ساز اسمبلی کے لیے منتخب ہوئیں۔ 1937ء میں ہی مسلمان خواتین کی تحریک کی وجہ سے اُن کو حقوقِ وراثت میں حصہ دینے کی یقین دہائی کروائی گئی..... یہ بات سچ ہے کہ خواتین کی کثیر تعداد ''قائداعظمؒ'' کی ولولہ انگیز قیادت اور ''مادرِ ملتؒ'' کی انتھک محنت کی وجہ سے مسلم لیگ میں شامل ہوئیں اور برصغیر کی مسلمان خواتین کو متحرک کیا۔ سڑکوں، گلیوں میں ظلم و جبر کے خلاف جنگ کی اُن کا مقصد دوقومی نظریہ کے تحت مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کا حصول تھا۔ تاہم ان سرگرم خواتین نے خواتین کی تعلیم، ان کی معاشی حالت اور معاشرتی حقوق جیسے معاملات پر جلسوں میں تقریریں کیں۔ اُن کو یقین تھا کہ خواتین کو اس نئے ملک میں علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے قول کے مطابق حقوق ملیں گے۔ جس ملک کو معروض وجود میں لانے کے لیے وہ مردوں کے شانہ بشانہ جدوجہد کر رہی ہیں۔

''قائداعظمؒ'' خواتین کی قابلیتوں اور صلاحیتوں پر پورا بھروسہ رکھتے تھے، اس لیے انہوں نے متحرک کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ خواتین کے حوالے سے ''قائداعظمؒ'' کی سوچ اسلامی فکر کے عین مطابق تھی جس میں مرد و زن کو اپنی فطری صلاحیتوں کے بھرپور استعمال کی تاکید کی گئی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ تحریک پاکستان میں جدید تعلیم یافتہ اور پردہ دار خواتین نے یکساں طور پر سرگرم کردار ادا کیا۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ کیا حصولِ آزادی کے بعد پاکستانی معاشرے میں خواتین کو وہ مقام مل سکا جس کی وجہ بجا طور پر مستحق تھیں؟ کیا اُنہیں ملک کی تعمیر و ترقی میں فعال کردار ادا کرنے کے وہ بھرپور مواقع میسر آسکے جن کی یقین دہانی

انہیں بابائے قوم حضرت قائداعظم محمد علی جناح نے کروائی تھی؟..... یقیناً نہیں..... بلکہ شعوری طور پر ایسی کوششیں کی گئیں کہ انہیں قومی زندگی میں آگے بڑھ کر کردار ادا کرنے کا موقع نہ مل سکے۔ مگر خواتین مایوس نہیں ہوئیں۔

قیام پاکستان کے بعد بھی بیداری نسواں کی تحریک جاری رہی اور حقوق نسواں کی بازیابی کے لیے کٹھن مراحل طے کرتی رہی۔ **1948**ء میں آئین ساز اسمبلی میں خواتین ارکان نے عورتوں کے معاشی حقوق کے تحفظ کے لیے ایک بل پیش کیا۔ اس بل کی حمایت میں ہزاروں خواتین نے اسمبلی کا گھیراؤ کیا۔ خواتین کی اس جدوجہد کے نتیجے میں حکومت پاکستان نے **1955**ء میں رشید کمیٹی تشکیل دی جس کا مقصد عائلی قوانین پر نظرِ ثانی کرنا تھا۔ بالآخر چھ سال بعد **1961**ء میں قانون منظور ہوگیا جو خواتین کی جدوجہد میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ بعد ازاں خواتین اراکین اسمبلی نے ''چارٹر آف ویمنز رائٹس'' کا بل پیش کیا جس میں عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق دینے اور ان کے لیے اسمبلی میں پانچ فیصد نشستوں کا کوٹہ مخصوص کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ **1956**ء کے آئین میں خواتین کے لیے **10** نشستیں مخصوص کر دی گئیں۔ علاوہ ازیں انہیں پانچ پانچ نشستیں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلیوں میں دی گئیں۔ **1973**ء کے آئین میں بھی نشستوں کی یہی تعداد برقرار رہی البتہ **1985**ء میں یہ تعداد دوگنا کر دی گئی۔ **2002**ء میں تو سینیٹ، قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں میں خواتین کے لیے **17** فیصد نشستیں مخصوص کر دی گئیں۔

پہلی دفعہ **2001**ء میں صدر پرویز مشرف نے خواتین کو قائد کے فرمان کے مطابق فیصلہ سازی میں شریک کرنے کے لئے ضلعی حکومت میں خواتین کو **33%** نمائندگی دی۔

خواتین کو سیاسی طور پر بااختیار بنانے کے ساتھ ساتھ انہیں معاشی لحاظ سے بااختیار بنانے کے عمل کا بھی آغاز **2002**ء سے ہو چکا ہے۔ سرکاری اداروں میں خواتین

کے لیے ملازمتوں کا 10 فیصد کوٹہ مخصوص کیا جا چکا ہے۔ گھریلو مزدور خواتین کو سماجی تحفظ مہیا کرنے کے لیے ایک قومی پالیسی تیاری کے مراحل میں ہے۔ بڑے شہروں میں خواتین کے چیمبرز آف کامرس وجود میں آ رہے ہیں۔ خواتین کو سماجی لحاظ سے بااختیار بنانے کے لیے بھی قانون سازی ہو چکی ہے۔ پچھلی حکومت نے دیہاتی خواتین کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے لیے جفاکش پروگرام شروع کیا۔ Gender Reform (GRP) Programme کے ذریعہ ہر ضلع میں خواتین کے لیے اقتصادی پروگرام شروع کیے گئے ہیں۔ تاہم ابھی کام ختم نہیں ہوا۔ اس لیے پاکستانی خواتین کی جدوجہد جاری رہے گی، اُس وقت تک جب تک کہ منزلِ مقصود پر نہ پہنچ جائیں اور ہماری منزل تحریک حصولِ پاکستان کے ایام میں واضح طور پر متعین ہو گئی تھی یعنی ایک جدید اسلامی، فلاحی، جمہوری معاشرے کا قیام۔

پاکستان ایک نظریے کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا۔ نظریۂ پاکستان کی بنیاد دینِ اسلام پر ہے اور بلاشبہ اسلام دنیا کا واحد دین ہے جس نے سب سے پہلے عورتوں کے حقوق کی آواز بلند کی، انہیں معاشرے میں عزت و تکریم عطا کی۔ اُنہیں مرد کے مساوی درجہ عطا فرمایا۔ اگر ہم قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کے نظریات و تصورات کے مطابق پاکستان کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو پاکستانی خواتین کو وہ تمام حقوق دینا ہوں گے جن کی ضمانت دینِ اسلام نے دی ہے۔

دنیا میں کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک اُس قوم کے مردوں کے ساتھ عورتیں بھی ملکی ترقی میں حصہ نہ لیں۔ دراصل یہی اصول نظریہ پاکستان ہے۔ عورت کو حق دینا دراصل سماج کو حق دینا ہے۔ جوں جوں عورت اپنے حقوق حاصل کرتی جائے گی اُسی رفتار سے ملک ترقی کرے گا۔ یہی ''قائداعظمؒ'' کا خواب تھا۔

☆☆☆☆☆

قومی ترقی میں خواتین کا کردار

''**قائداعظم محمد علی جناحؒ**'' اس امر سے بخوبی آگاہ تھے کہ خواتین کی شمولیت کے بغیر کوئی بھی تحریک نہ تو کامیاب ہوسکتی ہے اور نہ ہی کسی طور نمائندہ تحریک کہلاسکتی ہے۔

قیام پاکستان کی تحریک میں خواتین کی شمولیت کے حوالے سے قائد نے ایک بنیادی اور انقلابی کردار ادا کیا۔ ان ایام میں انہوں نے محترمہ فاطمہ جناح کو اپنے ہمراہ رکھا اور اس اقدام نے ''بیداریِ نسواں'' میں کلیدی کردار ادا کیا۔

قائداعظم کا نظریہ تھا کہ خواتین محض گھر کی چاردیواری تک محدود ہوکر نہ رہ جائیں بلکہ جدید علوم سے آراستہ ہوکر ملک وقوم کی ترقی میں فعال حصہ بنیں۔

28 مارچ 1948ء کو ریڈیو پاکستان ڈھاکہ سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا'' قوم کی تعمیر اور اس کے استحکام کے عظیم اور کٹھن کام کے لیے خواتین کو انتہائی اہم کردار ادا کرنا ہے۔ جس طرح خواتین نے پاکستان بنانے کی طویل جدوجہد میں حصہ لیا ہے۔ اب تعمیر پاکستان اور ترقی کے لئے اس سے بھی بڑی جدوجہد کرنا ہوگی''۔

''**قائداعظمؒ**'' کی دوراندیش سوچ تھی کہ اس نوزائیدہ مملکت کو سنگین بحرانوں سے سامنا ہوسکتا ہے، ان سے نمٹنے کے لئے ضروری ہے کہ خواتین بھی مردوں کے شانہ بشانہ

وطن کی تعمیر وطن ترقی میں حصہ لیں، وہ یہ جانتے تھے کہ ملک کی تقریباً آدھی ..... آبادی کو عضو معطل بنا کر اور چار دیواری میں محبوس کر کے ملک کو ترقی کی شاہراہ پر گامزن نہیں کیا جا سکتا۔

25 مارچ 1940 کو لاہور میں طالبات سے خطاب کرتے ہوئے کہا ''دنیا میں دو طاقتیں ہیں، ایک قلم اور دوسری تلوار ان میں سے کون سی قوت زیادہ طاقت ور ہے، اس فیصلہ کے لئے دونوں میں سخت مقابلہ ہے۔ میں نے اس سے پہلے بھی بارہا کہا ہے کہ ایک تیسری قوت بھی جوان پر حاوی ہے اور وہ عورت ہے۔ یہ عورت ہی ہے جو مرد کو یہ سکھا سکتی ہے کہ کس وقت تلوار کا استعمال ضروری ہے اور کس وقت قلم کی قوت سے کام لیا جا سکتا ہے۔ (یعنی عورت بہترین پالیسی میکر ہے) آپ کے شانوں پر بہت بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس وقت میں آپ کو کسی صورت مردوں سے پیچھے نہیں رہنا چاہیئے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ مغرب کی تقلید کریں، لیکن مردوں کو یہ احساس دلانا ضروری ہے کہ عورت اس کی مدد گار، دوست اور ساتھی ہے۔ عورت طاقت ہے اور اگر دونوں مل جل کر کام کریں تو اپنے گھر، خاندان اور قوم کی بہتر تشکیل کر سکتے ہیں۔''

1945ء میں پشاور میں خواتین کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے بانیِ پاکستان نے فرمایا ''میں بہت خوش ہوں کہ ہماری خواتین بھی میدان عمل میں آئی ہیں۔ خواتین ہمیشہ ایک عظیم کردار ادا کرتی رہی ہیں۔ جو ہاتھ جھولنا جھلا سکتا ہے وہ قوم کی باگ ڈور بھی سنبھال سکتا ہے۔ ہماری اسلامی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ہماری خواتین مردوں کے شبانہ بشانہ کھڑی رہی ہیں۔ کوئی بھی قوم اس وقت تک کوئی عظیم کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتی جب تک اس کے ساتھ اس کی خواتین شامل نہ ہوں''۔ ''قائداعظمؒ'' کی اس سوچ اور خیالات کے برعکس جاگیردارانہ ذہنیت کے حامل حکمرانوں، سیاست دانوں نے معاشی، سماجی اور سیاسی طور پر عورت کو برابری کی سطح پر نہیں رکھا، جس کے نتیجہ میں پاکستان کی ترقی میں خواتین کا کردار نہ ہونے کے برابر رہا۔

''سیاست میں خواتین کے اصل کردار کا تعین ہمیں آزادی کے بعد

کرنا۔ آزادی کے بعد ملک کی تعمیر وترقی اور سیاست میں خواتین کا ایک اہم کردار رہنا چاہیے تھا..... کیا یہ کردار رہا؟ ..... کیا اس کے لئے کوئی شعوری کوشش کی گئی .....؟ کیا خواتین کو وہ مواقع فراہم کیے گئے جن سے وہ سیاست، قانون سازی میں فعال کردار ادا کرنے کے قابل ہوسکتیں؟ .....ان سوالات کے جوابات ابھی تک عنقا ہیں''۔

دنیا کی کوی بھی قوم، معاشرہ اس وقت تک ترقی کی شاہراہ پر گامزن نہیں ہوسکتا جب تک اس معاشرے، قوم کے سبھی افراد ترقی کے لئے کوشاں نہ ہوں۔

''قائداعظمؒ'' نے اسی لئے بارہا کہا ''ہماری قوم کی خواتین کو مردوں کے ساتھ مل کر کام کرنا ہوگا، اس کے بغیر ہم ترقی نہیں کر سکتے۔''

عملی طور پر سیاست میں شمولیت کا طریقہ کار ہے کہ انتخابات کے ذریعے منتخب ہو کر قانون ساز ادارے میں پہنچیں یا پھر مخصوص سیٹوں پر خواتین کی نمائندگی کرتے ہوئے اسمبلی تک رسائی ہو۔ اور فیصلہ سازی میں کردار ادا کیا جائے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے عورتوں کا کردار اس معاملے میں بے حد کمزور رہا ہے۔ اس کی وجہ تعلیم کا فقدان، ہمارا جانبدارانہ سیاسی عمل اور عورتوں میں شعور کی کمی ہے۔

☆☆☆☆☆

(حصہ اوّل)

خواتین کی سیاست میں شمولیت

پاکستان میں خواتین کی سیاسی نمائندگی کے حوالے سے ہمیشہ سے دو آراء پائی گئیں۔ جہاں ایک طرف معاشرتی سطح پر ایک مثبت رائے پائی جاتی ہے وہاں ایسے لوگوں کی بھی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو خواتین کی سیاسی نمائندگی کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتی۔ بالخصوص پاکستان میں مذہبی عناصر اور رجعت پسند افراد خواتین کی ہر سطح پر نمائندگی کے سخت ناقدین میں شمار ہوتے ہیں۔

گذشتہ بلدیاتی سسٹم کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اس نظام میں خواتین کو 50 فیصد نمائندگی دینے کا اعلان کیا گیا۔ جس پر جہاں خواتین کی حمایت میں سرگرم افراد نے خوشی کا اظہار کیا، وہاں کچھ عناصر نے اس حکومتی فیصلے پر سخت احتجاج کیا اور اس کے خلاف بھرپور تحریک چلانے کا اعلان کیا۔ بدقسمتی سے خواتین کی سیاسی نمائندگی کی مخالفت صرف مذہبی عناصر نے نہیں کی، بلکہ کچھ سیاسی جماعتوں اور خصوصاً وڈیروں اور جاگیرداروں نے حکومتی فیصلے کی مذمت کی۔ خواتین کی بلدیاتی اداروں میں نشستوں کی نہ صرف زبانی مخالفت کی گئی بلکہ اخبارات بالخصوص اُردو اخبارات میں حکومتی فیصلے پر مذمت کی بھرپور مہم شروع کی گئی۔ بیشتر مذہبی رہنماؤں اور گروپوں نے باقاعدہ طور پر ''چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف'' سے مل کر اس فیصلے پر نظر ثانی کا مطالبہ کیا۔ جس کے نتیجے میں حکومت کو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنا

پڑی۔ لہٰذا حکومت نے 50 فیصد نشستوں کے فیصلے سے دستبرداری کا اعلان کر کے خواتین کی 33 فیصد نمائندگی کا فیصلہ کیا۔ مگر حکومت کے اس فیصلے پر بھی شدید مخالفت کا عمل جاری رہا۔ جماعت اسلامی اور جمعیت العلمائے اسلام (فضل الرحمٰن گروپ) نے اس فیصلہ کے خلاف عوامی سطح اور میڈیا کے ذریعے مخالفانہ مہم جاری رکھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سے وجوہات تھیں جن کی بنا پر مخالف عناصر نے خواتین کی نمائندگی کے خلاف مہم چلائی؟ جہاں تک مذہبی عناصر کا تعلق ہے، ان کا خواتین کی ترقی اور آزادی کے بارے میں ایک خاص نکتہ نظر ہے۔ ان کے خیال میں خواتین کا کام محض گھر کے نظام کو سنبھالنا اور گھر کی چار دیواری تک ہی محدود رہنا ہے۔ یہ مخصوص سوچ کے حامل افراد یہ سمجھتے ہیں کہ عورت اگر گھر سے باہر نکلے گی تو اس سے نہ صرف گھریلو نظام متاثر ہوگا بلکہ ہمارا معاشرتی خاندانی نظام بھی تباہ ہوگا۔ جماعت اسلامی نے تو خواتین کی نمائندگی کے خلاف جاری مہم کو خاندانی نظام کی بربادی سے تشبیہ دی اور ان کے کارکنوں اور رہنماؤں نے پریس کانفرنسوں، جلسے جلوسوں، قراردادوں، احتجاجی مظاہروں اور لٹریچر کے ذریعے لوگوں کو خواتین کی نمائندگی کے خلاف متحرک کیا۔ اسی طرح جمعیت العلمائے اسلام کے سربراہ مولانا فضل الرحمٰن نے نہ صرف مجوزہ بلدیاتی نظام کو عالمی استحصالی ایجنڈے سے مشروط کیا بلکہ انہوں نے خواتین کی نمائندگی کو شیطانی سازش قرار دیا اور کہا کہ سیاسی اداروں میں خواتین کی نمائندگی سے ملک میں بے حیائی اور فحاشی جیسے کلچر کو فروغ حاصل ہوگا۔ بعض اخباری بیانوں میں مولانا فضل الرحمٰن نے دھمکی دی کہ وہ خواتین کو بزور طاقت روکیں گے اور انہیں انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ جس پر خواتین میں یقینی طور پر خوف وہراس پیدا ہوا خصوصاً سرحد میں مولانا کے بیانات نے خاصی مشکلات پیدا کیں۔

مذہبی عناصر کے ان خدشات اور اعتراضات کا اگر معروضی تجزیہ کیا جائے تو یہ بات بجا طور کہی جاسکتی ہے کہ مذہبی عناصر کی اس مخالفانہ مہم کی بنیاد ٹھوس دلائل نہیں مثلاً یہ کہنا

کہ خواتین کی نمائندگی سے خاندانی نظام تباہ ہو جائے گا، حقیقت سے مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ آج معاشرے میں خواتین تمام شعبوں میں متحرک اور فعال انداز میں کام کر رہی ہیں بلکہ بعض شعبوں میں تو خواتین کی کارکردگی مردوں کے مقابلے میں خاصی بہتر ہے۔ وہ طب، انجینئرنگ، فارمیسی، کمپیوٹر، بینکنگ، کامرس، انتظامی امور، ذرائع ابلاغ، تعلیم وصحت جیسے تمام شعبوں میں سرگرم نظر آتی ہیں۔ اگر ان شعبہ جات میں گھر میں باہر کام کرنے پر ان کے خاندانی نظام کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ خواتین کے مقامی سطح کے اداروں میں شریک ہونے اور مقامی مسائل وترقی کے عمل اور فیصلہ سازی میں شامل ہونے سے خاندانی نظام تباہ ہو جائے گا؟

جہاں تک گھریلو ذمہ داریوں کا تعلق ہے تو خواتین معاشرے میں دوہری ذمہ داریاں سنبھالتی ہیں۔ یعنی پہلے روزگار کی ذمہ داریاں اور پھر بچوں کی ذمہ داریاں اور گھریلو امور کی انجام دہی۔ اس لیے یہ کہنا کہ مقامی اداروں میں نمائندگی سے وہ گھریلو ذمہ داریوں سے لاتعلق ہو جائیں گی۔ بے معنی بات ہے۔ پھر گھریلو ذمہ داریوں کا تعلق صرف عورت سے مشروط نہیں بلکہ مرد بھی اس عمل میں حصہ لے سکتے ہیں۔ مذہبی عناصر کی جانب سے یہ کہنا کہ خواتین مقامی اداروں میں نمائندگی کے ذریعے فحاشی اور عریانی کے کلچر کو فروغ دیں گی، خواتین کی تذلیل ہے اور نام نہاد مذہبی عناصر کی منفی سوچ کی عکاسی کرتی ہے۔ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ مذہبی عناصر خصوصاً جماعتِ اسلامی نے، جو خواتین کی نمائندگی کے خلاف ہیں، بلدیاتی انتخابات میں خواتین کی نشستوں پر بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جماعت اِسلامی اور عوامی تحریک کے کارکن خواتین کی ایک بڑی تعداد نے نہ صرف انتخابات میں حصہ لیا بلکہ ان دونوں جماعتوں کے بقول ان کی خواتین بڑی تعداد میں کونسلر منتخب ہوئیں یہ حقائق ان جماعتوں کے دہرے معیار کے بھرپور عکاس ہیں۔

''مذہبی عناصر کے علاوہ بعض سیاسی وڈیرے اور جاگیردار اور مقامی طاقتور عناصر بھی خواتین کی نمائندگی کے خلاف تھے۔ اگرچہ براہِ

راست ان نشستوں کے خلاف نہیں تھے لیکن ان کا کہنا تھا کہ حکومتی فیصلہ صرف ایک نا تمام آرزو ہے، اتنی بڑی تعداد میں سیاست میں حصہ لینے کیلئے خواتین میسر ہی نہیں۔ مجھے ذاتی طور پر بعض معروف سیاست دانوں نے براہِ راست کہا کہ ملک میں 33 فیصد عورتوں کی نمائندگی ممکن نہیں۔ دراصل ان عناصر کا مسئلہ سمجھ میں آتا ہے کہ ملک میں پہلی بار خواتین کو براہِ راست نمائندگی کا حق مل رہا تھا۔ اس لیے انہیں اپنے آپ کو مطمئن کرنے میں خاصی دشواری پیش آرہی تھی''۔

چونکہ ہمارا معاشرہ مردوں کا معاشرہ ہے۔ اس لیے سماجی طور پر خواتین کا نمائندہ ہونا مردوں کو ذہنی طور پر قبول نہیں ہو پا رہا تھا۔ ماضی میں اگر چہ خواتین نمائندہ ضرور تھیں مگر ان کی تعداد نہ صرف بہت کم تھی بلکہ ان کی نمائندگی کو خانہ پُری کیلئے استعمال کیا جاتا رہا۔ اب اتنی بڑی تعداد میں خواتین کا براہِ رست نمائندہ ہونا از خود مردوں کی سماجی طاقت کو کمزور کرنے کا سبب بن سکتا تھا۔ یہ نہیں چاہتے تھے کہ خواتین سماجی طور پر مضبوط ہوں کہ اس سے مقامی سطح پر ان کی طاقت میں کمی ہوگی۔ خواتین ان پر مکمل انحصار کرنے کی بجائے از خود اپنے مسائل حل کر سکیں گی۔ حالانکہ یہ دونوں عنصر یعنی مذہبی و سیاسی عناصر جو خواتین کی نمائندگی کے مخالف ہیں۔ اس بنیادی بات کو سمجھ نہیں رہے کہ آج ہمارے معاشرے میں خواتین کے مسائل مردوں کے مقابلے میں زیادہ گھمبیر ہو گئے ہیں اور وہ روزمرہ مسائل کی چکی میں بری طرح پس چکی ہیں، دوسری طرف ماضی کے مرد نمائندے ان کے مسائل کو حل کرنے میں کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کر سکے لہٰذا اگر خواتین مقامی سطح پر نمائندہ بن کر سامنے آئیں تو ان کے مسائل میں کمی واقع ہو سکتی ہے۔

حکومت نے جب خواتین کی نمائندگی کا حتمی اعلان کیا تو ملک بھر میں سیاسی، سماجی کارکن خواتین کی دلچسپی میں اضافہ ہوا۔ جوں جوں انہیں اس بات سے آگاہی ہوئی کہ وہ بھی

نہ صرف انتخابات میں حصہ لے سکتی ہیں بلکہ اس بار حکومتی سطح پر ایسے اقدامات بھی سامنے آئے ہیں جن سے ان کی نمائندگی کو یقینی بنایا گیا ہے تو ان میں ایک نیا حوصلہ پیدا ہوا۔

پاکستان کی عام عورت کے اندر سیاسی عزائم کا فروغ ایک نئے دور کی عکاسی کرتا ہے۔ اسی طرح دیگر ذرائع ابلاغ بالخصوص الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے بھی حکومت نے خواتین میں اس احساس کو اُجاگر کیا کہ وہ انتخابی عمل میں حصہ لیں۔ حکومت ان کی بھرپور مدد کرے گی مگر خواتین کے اندر سیاست میں حصہ لینے کی دلچسپی نمایاں ہونے کے باوجود دلوں میں عجیب قسم کا خوف بھی تھا۔ مقامی مردوں کی رضامندی کے بغیر ایسا کس طرح ممکن ہوگا؟ اور مقامی برادریوں، سیاسی گروپوں اور بالخصوص ان کے اپنے خاندان کے بزرگ کیونکر ان کی حمایت کریں گے؟ انہیں اس بات کا بھی اچھی طرح احساس تھا کہ ماضی میں اس حوالے سے ان کی کبھی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی۔

''ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ دوران مہم جب خواتین کو اس بات کا علم ہوتا کہ وہ بھی کونسلر بن سکتی ہیں تو ان کے چہروں پر شادمانی کا احساس نمایاں ہوتا تھا مگر حالات وواقعات اور معاشرتی تعصّبات کے پیش نظر وہ خوف میں بھی مبتلا نظر آتی تھیں۔ جہاں خواتین کو ووٹ ڈالنے کی اجازت نہ ہو وہاں وہ انتخابات کیسے لڑسکیں گی؟ بہت سی خواتین نے ان سماجی رویوں کی بھی نشاندہی کی جو خواتین کے بارے میں مضبوط ہیں۔ انہوں نے کہا کہ حکومت کا یہ فیصلہ بڑا اچھا ہے مگر ہمارے خاندان اور مقامی طاقت ور عناصر ہمیں کبھی بھی انتخابات میں حصہ نہیں لینے دیں گے''۔

بالخصوص پہلے مرحلے میں جن اضلاع میں انتخابات ہوئے وہ پاکستان کے پسماندہ اضلاع تصور کئے جاتے ہیں۔ ان اضلاع میں جاگیردارانہ ذہنیت مضبوط ہے اور وہاں کی معاشرت بھی قبائلی طرز کی ہے۔ ان اضلاع میں خوف کی فضا عروج پر تھی اور یہی وجہ

تھی کہ جب بھی کوئی خواتین کو انتخابات لڑنے کی دعوت دیتا تو وہ سہم جاتیں لیکن جیسے جیسے انتخابات کے دن قریب آتے گئے اور خواتین کی نامزدگی کا عمل بذریعہ پینل سسٹم سامنے آیا تو خوف کی فضاء میں کمی واقعی ہوئی۔

''پہلے مرحلے کے تحت 84 فیصد سے زیادہ خواتین بطور کونسلر منتخب ہوئیں تو دیگر مراحل میں موجود اضلاع میں خواتین کے اندر خوف کی شدت میں مزید کمی آئی اور انہوں نے زیادہ جوش وخروش سے حصہ لیا''۔

جب حکومت نے خواتین کو براہ راست الیکشن کے ذریعے 33 فیصد نمائندگی دینے کا فیصلہ کیا تو اس وقت بھی یہ کہا جارہا تھا کہ ہمارے ہاں چونکہ خواتین کو نمائندگی کا تجربہ نہیں اور بالخصوص دیہی سطح پر بیشتر خواتین ناخواندہ ہیں لہٰذا وہ سامنے آبھی گئیں تو اس انتظام کو نہیں چلا سکیں گی؟ جب مقامی حکومتوں کے مرحلہ وار نتائج سامنے آئے تو اس بحث میں شدت آگئی کہ ان پڑھ اور جاہل خواتین نمائندہ کے طور پر سامنے آئی ہیں اور ان میں بیشتر مقامی سیاسی وسماجی شخصیات کی گھریلو ملازمائیں ہیں جنہیں محض خانہ پری کیلئے سامنے لایا گیا ہے۔اس لیے خواتین کے حوالے سے اختیارات کی نچلی سطح پر منتقلی کا منصوبہ ناقابل عمل ہے۔

یقیناً یہ سوال کافی غور طلب ہے اور اس پر تحقیق کی ضرورت ہے کہ جو خواتین تمام تر مشکل حالات کے باوجود بطور کونسلر سامنے آئی ہیں، وہ کون ہیں اور کیا کرتی رہی ہیں اور کن مراحل سے گزر کر انہیں الیکشن لڑنا پڑا؟ لیکن جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ تمام خواتین یا ان کی اکثریت ان پڑھ اور جاہل ہے، یہ مکمل سچ نہیں۔ بلدیاتی انتخابات کے تمام مراحل کا جائزہ لیا جائے تو ان پڑھ خواتین کے مقابلے میں ایسی خواتین کی اکثریت جو پڑھی لکھی ہیں۔شہروں میں تو پڑھی لکھی خواتین غالب اکثریت میں ہیں مگر دیہات میں بھی خواندہ خواتین منتخب ہوئیں۔اگرچہ دیہات میں یہ تعداد یقیناً کم ہے لیکن ہمیں اس حوالے سے دو

باتوں پر ضرور غور کرنا چاہیے۔ اول یہ کہ خواتین کی تعلیم شہروں کے مقابلے میں دیہات میں بہت کم ہے اور اب نئی نسل کی بچیاں تعلیم حاصل کر رہی ہیں یا حاصل کر چکی ہیں، وہ موجود سیاسی سسٹم کے لیے ضروری ہیں مگر ان کی عمر 25 سال نہیں اور ہمارے ہاں انتخابی مقابلہ میں حصہ لینے کے لئے کم از کم عمر کی شرط 25 سال ہے۔ دیہاتوں اور شہروں میں بیشتر پڑھی لکھی خواتین، جو یقیناً ان انتخابات میں حصہ لینے کی خواہش مند تھیں، عمر میں کمی کے باعث حصہ نہیں لے سکیں۔ ہمیں بطور مبصر اس انتخابی مہم میں ایسی لاتعداد خواتین سے بات چیت کرنے کا موقع ملا جو بطور کونسلر جیت کر سامنے آئیں۔ ان میں خاصی تعداد پڑھی لکھی عورتوں کی تھی جو ایک خوش آئندہ بات ہے۔ یہ خواتین ملک کے پسماندہ علاقوں یعنی راجن پور، ڈی جی خان، لیہ، بھکر، میانوالی خوشاب اور سرگودھا سے تعلق رکھتی تھیں۔

ہمیں خواتین کی تعلیم کو بنیاد بنا کر ان کی نمائندگی پر تنقید کرنے سے پہلے ذرا اس بات پر بھی نظر دوڑانی چاہیے کہ ماضی میں ہمارے ہاں جو مرد حضرات نمائندہ کے طور پر سامنے آتے تھے، ان کی تعلیم اور صلاحیت کیا تھی۔ ریکارڈ موجود ہے کہ ہمارے بیشتر اراکین ان پڑھ تھے۔ تاہم انہیں اس قدر تنقید کا نشانہ نہیں بنایا گیا جیسے تعلیم کو جواز بنا کر خواتین کی نمائندگی کو تنقیدی کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ اس پر بھی غور کیا جائے کہ خواتین کی ناخواندگی کی وجہ بھی خود مقامی سطح پر موجود مرد حضرات کے رویئے ہیں جنہوں نے ان کی تعلیم کی اہمیت کو بھی تسلیم نہیں کیا۔

جہاں تک خواتین کی قابلیت اور صلاحیت کا تعلق ہے تو یہ بات ٹھیک ہے کہ سیاسی حوالے سے عورتوں کے پاس بہت کم قابلیت اور تجربہ ہے اور جو خواتین منتخب ہوئی ہیں، ان کا سیاسی تجربہ نہ ہونے کے برابر ہے مگر اس بات کا تجزیہ کرتے وقت اس پر بھی غور کیا جائے کہ ماضی میں کب خواتین کو اتنی بڑی تعداد میں نمائندگی کا موقع ملا۔ وہ پہلی بار بطور نمائندہ سامنے ہیں۔ ماضی میں جو نمائندہ خواتین تھیں۔ وہ ایک مخصوص طبقہ اور خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ اگر اب انہیں فیصلہ سازی کے عمل میں نمائندگی کا موقع ملا ہے تو وقت گزرنے

کے ساتھ ساتھ ان کے تجربے اور صلاحیت میں ضرور اضافہ ہوگا اور وہ زیادہ بہتر انداز میں اپنا کردار ادا کر سکیں گی۔

اس لیے ضرورت اس امر کی تھی کہ خواتین کی ابتدائی نمائندگی کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے اور ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ خود مرد حضرات بھی یقیناً جب پہلی بار بطور نمائندہ سامنے آتے ہیں تو انہیں بھی سیکھنے کے مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس طرح خواتین بھی سیکھنے کے مراحل سے گزر رہی ہیں اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ اس وقت یہ بحث کہ خواتین کی تعلیم کیا ہے اور ان کی قابلیت کیا ہے، اتنا اہم مسئلہ نہیں بلکہ اس کے مقابلے میں زیادہ ضروری یہ ہے کہ خواتین چاہے وہ تعلیم یافتہ ہیں یا غیر تعلیم یافتہ، تجربہ رکھتی ہیں یا نہیں، اس عمل میں حصہ لیں اور بطور نمائندہ سامنے آئیں۔ جو مواقع ابتدائی طور پر خواتین کو دیئے گئے ہیں اس سے بھرپور فائدہ اُٹھایا جائے نہ کہ ان کی تعلیم، تجربہ اور صلاحیت کو بنیاد بنا کر انہیں سیاسی عمل میں حصہ لینے سے روک دیا جائے۔ مسئلہ خواتین کی تعلیم اور تجربہ کا نہیں بلکہ ان کے بارے میں ہمارے تعصّبات کا ہے اور اگر ہم ان تعصّبات سے خود کو دُور کر لیں تو شاید یہ بحث ختم ہو جائے اور ہم مل جل کر ترقی کے عمل میں حصہ لے سکیں۔

☆☆☆☆☆

خواتین کی سیاست میں شمولیت

(حصہ دوئم)

ملک کے سیاسی عمل میں حصہ لینا ہر شہری کا حق ہے۔ پاکستان کا آئین اور قانون عورت اور مرد کو مساوی حقوق دیتے ہیں۔ اس لیے خواتین کو ملک میں برابری کے حقوق حاصل ہیں۔ یہ کہنا حقیقت بیانی سے گریز ہوگا۔ سالہا سال کے امتیازی برتاؤ مردوں کے زیر تسلط رہنے اور سیاسی زندگی سے الگ تھلگ رکھے جانے کے پیش نظر سیاسی سرگرمیوں میں پاکستانی خواتین کی شمولیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کی بہت وجوہات ہیں، ابھی تک ہمارے معاشرے میں عورتوں کے سیاست میں حصہ لینے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا جس کی وجہ سماجی، تاریخی اور کچھ مذہبی سوچ رکھنے والے گروہوں کی ہے۔

دنیا کے تمام معاشرے مرد کی حاکمیت سے تعلق رکھتے ہیں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ عورت گھر اور مرد باہر کی دنیا کا مالک ہے، گویا یوں عورت کو اہم قومی زندگی کے معاملات سے بڑی خوبصورتی سے الگ کر دیا گیا۔ یہ تصور بھی عام ہے کہ خاندان طبقے یا سیاسی نظریات اور مفادات کے بارے میں خواتین کی سوچ ان کے خاندان کے مردوں یا گروپ کے مردوں کی سوچ ایک ہوتی ہے، سو اس کا اظہار مرد نمائندے بخوبی کر سکتے ہیں۔

مگر تحقیق نے اس تصور کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ اکثر معاملات میں خواتین کی سوچ اپنے مردوں کی سوچ سے مختلف ہوتی ہے۔ اور یوں یہی فرق سیاسی میدان میں جہاں خواتین کی شمولیت اور نمائندگی نہیں ہوتی یا کم ہوتی ہے۔ ان کی سوچ اور ضرورت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ سیاسی جماعتوں کی مرکزی اور صوبائی ایگزیکٹیو کمیٹیوں میں خواتین کی نمائندگی بہت ہی کم ہے۔ ان کو مشاورت میں شامل نہیں کیا جاتا۔ قومی زندگی کی ہر سطح پر خواتین کی یہ نہایت معمولی نمائندگی سیاسی جماعتوں کے اس دعوے کی نفی کرتی ہے۔ کہ وہ خواتین کو سیاسی معاملات میں ساتھ لے کر چلنا چاہتے ہیں۔

1997ء کی قومی اسمبلی میں خوتین کی تعداد صرف چھ تھی، جبکہ چاروں صوبائی اسمبلیوں میں صرف ایک خاتون کی نمائندگی تھی، اور سینٹ کی 83 سیٹوں پر صرف دو خاتون ارکان تھیں۔ عورتوں کے سیاسی منظر سے تقریباً غائب رہنے کے بارے میں سیاسی جماعتوں کا کہنا ہے کہ خواتین خود سیاسی میدان میں قدم رکھنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتی ہیں، جبکہ یہ بات بالکل غلط ہے ٹکٹوں کے حصول کے سلسلے میں موصول ہونے والے خواتین کی درخواستوں کی تعداد سے اس بیان کی تردید ہوتی ہے۔ حقیقی جمہوریت کے قیام کے لیے فیصلہ سازی کے عمل میں عورت اور مرد کی مساوی شراکت ضروری ہے۔ یہ کتنی بدقسمتی ہے کہ ایسے فیصلے اور قوانین جو خواتین کی زندگیوں پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں وہ بھی ایسے اداروں کے ہاتھ میں ہیں جن پر مردوں کا قبضہ ہے جن میں عورتوں کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہی وجہ کہ عوتوں کے خلاف امتیازی قوانین کی بھرمار ہے اور ایسی پالیسیاں اختیار کرنے کا رواج ہے جن کا مقصد عورتوں کو فعال زندگی سے الگ تھلگ رکھنا ہے۔ جبکہ عورتوں کیلئے ایسے امور کے بارے میں جن کا ان کی زندگی سے براہ راست تعلق ہے۔ فیصلہ کن آواز بلند کرنا جتنا اہم ہے اتنا ہی اہم قومی زندگی کے دوسرے شعبوں میں ہر سطح پر اپنی رائے دینا اور اپنا نکتہ نظر ریکارڈ کرنا ہے تا کہ ان معاملات پر فیصلوں میں خواتین کی رائے بھی

شامل ہو۔

''قائداعظمؒ نے ہمیشہ اپنی تقریروں میں کہا کہ ''پچاس فیصد آبادی کو گھروں میں قید رکھ کر ترقی نہیں کی جاسکتی۔ انہوں نے بار بار یہ اعلان کیا کہ پاکستان کی تحریک میں خواتین نے مردوں کے شانہ بشانہ جدوجہد میں برابر حصہ لیا اس لیے ان کا حق پاکستان میں مردوں کے برابر ہے۔ ان کی معاملات اور ترقی میں برابری کی حیثیت ہوگی''۔

مگر بڑے افسوس کی بات ہے کہ پاکستان کے خالق قائداعظمؒ کی بات کے خلاف ملک کی مذہبی جماعتیں یہ کہتی ہیں کہ خواتین کی مخصوص نشستیں سینٹ، قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں نہیں ہونا چاہیں۔ خاص طور پر لوکل باڈی میں خواتین کی 33% نشستوں کے خلاف بیانات رہے ہیں۔ اس کے جواز میں سیاسی جماعتیں جو بات کر رہی ہیں اس میں بڑا تضاد ہے۔ پہلی بات تو وہ یہ کہتے ہیں کہ خواتین کو گھروں سے باہر نکالنے کا یہ فارمولہ مغرب کا ہے مگر ساتھ ہی ان کا کہنا ہے کہ خواتین کی الگ کمیٹی یا اسمبلی ہو، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس کے لیے عورتوں کو گھر سے باہر نہیں نکلنا ہوگا؟ دوسری بات پر اعتراض کرتے ہوئے وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم لوکل باڈی میں خواتین کی خواتین نمائندوں کے ساتھ ڈائیریکٹ الیکشن کے خلاف ہیں۔ کیونکہ ان کو گھر گھر جا کر ووٹ مانگنا ہوگا مگر یہ جماعتیں 1973ء کے آئین کے مطابق جنرل سیٹ پر مرد نمائندوں کے خلاف الیکشن لڑنے کے خلاف نہیں۔ حالانکہ ان خواتین کو بھی گھر گھر جا کر ووٹ مانگنے ہوتے ہیں۔ پھر وہ بھول جاتے ہیں کہ تمام سیاسی جماعتوں بمعہ جماعت اسلامی اور دوسری مذہبی سیاسی جماعتوں کی خواتین ورکرز اپنے مرد نمائندوں کیلئے گھر گھر جا کر کنوینسنگ کرتی ہیں۔ اس پر ان کا اعتراض نہیں۔ یہ ہے ان لوگوں کا تضاد اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دراصل ان کو خواتین کا ملکی معاملات میں شامل ہونا پسند نہیں۔ اب یہ فیصلہ قوم اور خواتین کا ہے کہ وہ ''قائداعظم'' کے فرمودات کو مانے یا ان

مذہبی سیاسی جماعتوں کی بات کوااہمیت دیں، جنہوں نے پاکستان کی تخلیق کے وقت بھی قدم قدم پر ''قائداعظم'' کی مخالفت کی تھی۔

دراصل پاکستان کی معاشرتی سوچ میں عورتوں کومعاشی اوراقتصادی لحاظ سے عضو معطل سمجھا جاتا ہے۔عام خیال یہ ہے کہ عورت دولت پیدانہیں کرتی بلکہ دولت پیدا کرنے والوں پر ایک بوجھ ہے، اس منفی سوچ کے دو پہلو ہیں۔پہلی بات تو یہ ہے کہ صدیوں سے رائج معاشرتی رویوں نے عورت کو''گھر کا چراغ''، گھر کی عزت''اور''شرم وحیا کی عورت'' ایسی اصلاحات کا غلام بنا کراسے بااعتماداور بھرپورطریقہ سےقومی تعمیروترقی میں اپنا کردارادا کرنے میں زبردستی روکا ہے۔اس کے باوجوداگرکوئی عورت ضرورتاًیانظریاتی شعور کی بناء پر مردوں کے معاشرے میں کام کرکے معاشی لحاظ سے ایک پیداواری اہلیت کا مظاہرہ کرتی ہےتو اس کے بارے میں دوطرح کے رویوں کا اظہار کیا جاتا ہے۔اول یہ کہ اکثر کارکن خواتین کوسنجیدہ ورکر سمجھنے کے بجائے''شوقیہ کارکن'' کا درجہ دے کرانہیں قابل توجہ نہیں سمجھا جاتا۔

دوسرے یہ کہ گھر سے باہرنکل کرکام کرکے اپنی اہلیت ثابت کرنے والی خواتین کو معاشرے کے روایتی اندازفکر کے مطابق انہیں گھر سے باہر نکلنے کا شوقین سمجھ کرانکے کردار کے بارے میں منفی اندازِفکراپنا لیتے ہیں۔گھر کے اندر باپ بھائی یا شوہر بھی اسی سوچ کے دباؤ میں خواتین کو باہرنکل کرسیاست کرنے یا ملازمت کرنے یا کوئی بھی کام کرنے سے روکتے ہیں۔خواتین کوسیاست میں آنے کیلئے لوہے کا کلیجہ کرنا پڑتا ہے۔

آج دنیابدل رہی ہے۔ہم سب ایک''گلوبل ویلج''میں رہ رہے ہیں۔پاکستان دنیا کے دوسرے ملکوں سے الگ ہوکرنہیں سوچ سکتا۔اگر پاکستانی معاشرے کوایک مہذب اورترقی یافتہ جمہوری معاشرے کے طور پر قائم رکھنا ہےتو پھر پچاس فیصد آبادی کومساوی مواقع اوریکساں قانونی اورآئینی حقوق دیئے بغیر یہ مقصد پورانہیں ہوگا۔

☆☆☆☆☆

خواتین اور پارلیمنٹ

پاکستان کی سیاست کے مرکزی ڈھانچے میں خواتین کی شمولیت ہمیشہ دشوار عمل رہا ہے۔ غیر مستحکم، بحرانوں سے بھری سیاسی تاریخ۔ آمروں کی طالع آزمائی۔ چور دروازوں سے اقتدار پر قبضہ، بدعنوان بیوروکریسی، نااہل انتظامیہ، مردوں کی حاکمیت، خودغرضی کے ایجنڈے پر کام کرنے والی سیاسی جماعتوں نے ہمیشہ خواتین کے سیاست میں آنے کے عمل کو روکنے کی کوشش کی ہے۔

معاشرتی عمل میں عورتوں کے لئے امتیازی رسم ورواج، مرد کی اپنی حاکمیت کے لئے مذہب کا غلط استعمال اور حکمران افراد کی حوصلہ شکنی، معاشرتی اور ثقافتی رکاوٹوں کی وجہ سے صورت حال اور بھی گھمبیر ہو جاتی ہے۔

عورتوں کا سماجی لحاظ سے ناموافق مقام اور ان کی سیاسی ومعاشی زندگی میں بھرپور شرکت کی راہ میں حائل معاشی، سماجی اور قانونی رکاوٹوں کو صحیح تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کا عکس پاکستان کے 1956ء اور 1973ء کے آئین میں عورتوں کے لئے مخصوص نشستوں کی دفعات میں بھی نظر آتا ہے۔

سیاسی جماعتوں میں خواتین کی شرکت مانپے کا پیمانہ خواتین ونگ کا قیام سمجھا جاتا ہے، مگر حقیقت ہے کہ انہیں کسی قسم کی خودمختاری حاصل نہیں ہے۔ سیاسی جماعتوں اور ایوان میں عورتوں کو فیصلہ سازی کا حق نہیں ہے۔

خواتین کے ذریعے فقط پارٹی ایجنڈے کو فروغ دیا جاتا ہے اور بنیادی طور پر انہیں الیکشن میں خواتین کو ووٹ دینے کی ترغیب کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

2002ء کا سال عورتوں کی سیاسی نمائندگی کے حصول کے لئے بے حد اہم ہے۔ انہیں قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں اپنی سیاسی پارٹیوں کی نامزدگیوں کے حوالے سے 17 فیصد اور مقامی (ضلعی حکومتوں) میں 33 فیصد نمائندگی کا حق ملا۔

عورتوں کو مسلسل پانچ برس تک ان عوامی اداروں میں خود کو منوانے، اداروں کو قواعد وضوابط جاننے اور ان اداروں میں کارکردگی کے عمل میں مثبت حصہ ڈالنے کے مواقع پر میسر آئے۔ انہوں نے تشدد، صحت، تعلیم اور ماحولیات، جیسے اہم مسائل کو اجاگر کرنے میں بڑا کلیدی کردار ادا کیا۔

کوٹہ سسٹم کے ذریعے عورتوں کو حکومت کا حصہ بننے کا موقع تو مل گیا، مگر اس طرح عورتوں کی ان اداروں میں مستقل نمائندگی کو فروغ حاصل نہیں ہوا۔ ان کے حلقہ انتخابات نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے ہم خیال لوگوں کے حلقے نہیں بنا سکیں۔

خواتین کے پارلیمنٹ میں بھرپور طریقے سے سرگرم نہ ہونے کا سبب ان کی مخصوص نشستیں ہیں۔ جن کے سبب نہ صرف مرد اراکین پارلیمنٹ بلکہ بذریعہ ووٹ منتخب خواتین بھی ان کو برابر کی حیثیت نہیں دیتیں اور ان کی سرگرم کارکردگی کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔

ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا رہا ہے کہ ان مخصوص نشستوں پر منتخب ہونے والی خواتین دراصل اپنے ان مردوں کی نمائندگی کرتی ہیں جو عام انتخابات میں ہار گئے تھے۔ ان تمام منفی پہلوؤں کے باوجود ان مخصوص نشستوں کے ذریعے آنے والی خواتین نے فیصلہ ساز اداروں میں عورتوں کی شمولیت اور ان کی رسائی بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ مخصوص نشستوں پر منتخب ہونے والی خواتین کی اہمیت کے بارے میں شکوک کو رفع کرنے کے لئے ان کے انتخاب کا طریقہ کار تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔

گذشتہ چند سالوں میں ہونے والی مسلسل سیاسی شرکت نے سیاست میں سرگرم عورتوں کی کارکردگی کو بہتر بنایا اور ثابت کیا کہ وہ اس کام کی اہل ہیں۔ اگرچہ یہ پارلیمنٹ میں اقلیت میں تھیں لیکن یہ ایک مفید اور مثبت آغاز تھا۔ یہ خواتین مسلسل سرگرم تھیں اور امور

سیاست کے معاملات کو تیزی سے سمجھ رہی تھیں۔ انہوں نے اسمبلیوں میں خواتین کے مسائل کو بڑی کامیابی اور بے باکی سے پیش کیا۔

عورتوں کی نمائندگی اور شرکت کو زیادہ موثر بنانے کے لئے ضروری ہے کہ نہ صرف موجودہ امتیازات اور حدود ختم کی جائیں بلکہ ان کی صلاحیتوں کو مہمیز کرنے کے لئے اور مہارت کے فروغ کے لئے تربیتی مراکز قائم کئے جائیں۔ تاکہ ان کے سیاسی عمل اور فیصلہ سازی کے بارے میں علم میں اضافہ ہو، انتخابی مہموں میں حصہ لینے کی تربیت ہوگی تو ان کا کردار اور زیادہ مؤثر ہوگا۔

کام کی جگہوں پر عورتوں اور مردوں کے فرق کو ختم کرنے اور عورتوں کی معاشرے میں حیثیت اور ان کی بنیادی حقوق کے بارے میں رویئے تبدیل کرنے کے لئے میڈیا میں وسیع پیمانے پر منفی حیثیت کے فرق کو ختم کرنے کے لئے مہم چلانے کی ضرورت ہے۔

ضرورت ہے کہ سیاسی جماعتوں کی وابستگی سے قطع نظر بھی عورتوں کے گروپ بنائے جائیں۔ جہاں عورتیں اس مقصد کے ساتھ اکٹھی ہوں کہ کس طرح عورتیں ترقی کر سکیں اور انہیں بااختیار بنایا جائے۔ اس طرح کے پلیٹ فارم کو اگر موثر طور پر استعمال کیا جائے تو وہ خواتین قانون سازوں کی وجہ سیکہ ہمیشہ اقلیت میں ہوتی ہیں۔ ایک وسیع اور زیادہ طاقتور سیاسی قوت میں بدل دے گی۔ اور اس طرح پالیسیوں میں تبدیلی کے لئے خواتین سیاست دانوں کی آواز زیادہ موثر ہو جائے گی۔

لیکن اس کے ساتھ سول سوسائٹی کی تنظیموں کا کردار بھی بہت اہم ہے۔ ان کا کام مسائل کو سامنے لا کر عوامی پیروی کی اپنی سرگرمیوں کو بڑھانا اور ضرورت کے وقت دباؤ ڈالنے کا ہتھیار بننا ہے۔

حکومت نے عالمی اور بین الاقوامی سطح پر جو معاہدے اور اقرار نامے کر رکھے ہیں۔ ان کا بھی مسلسل جائزہ اور نگرانی کرنا ان کی اہم ذمہ داری ہے۔

☆☆☆☆☆

مسلمان خواتین میں حقوق سے آگاہی

جب آنحضرت رسول مقبول **صلی اللہ علیہ والہ وسلم** پر قرآن مجید فرقان حمید کا نزول ہوا تو وہ دور دنیا عرب کی جہالت اور ذہنی پسماندگی کا دور تھا۔ قبائلی رسم ورواج میں جکڑا ہوا ایک ایسا معاشرہ تھا جہاں عورت کو دیگر پالتو جانداروں کی طرح اپنی ملکیت سمجھا جاتا تھا۔

کچھ قبائل تو بچیوں کی پیدائش کے فوراً بعد زندہ دفن کر دیتے تھے۔ اسلام صرف مذہب ہی نہیں بلکہ دین ہے، جو لوگوں کے معاملات کو عبادت کی طرح اہم سمجھتا ہے۔

اسلام ایک ترقی پسندانہ سوچ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے نہ صرف عورت کو مرد کے برابر حقوق اور حیثیت دی بلکہ عورت کو وراثت کا حقدار بھی ٹھہرایا۔ زندگی کے کچھ امور میں تو عورت کو مرد سے زیادہ فوقیت حاصل ہے۔ عورت کو اس کی مرضی سے شادی کا حق دیا۔ عورت کو خلع کا حق بھی دیا۔

تجارت، جنگی مہمات میں شمولیت، غرضیکہ اس دور میں جو حق اور جو کام مرد کرتے تھے اس کی اجازت شرعاً و قانوناً عورت کو بھی حاصل تھی۔ اسلام نے عورت کو عزت، مقام، مرتبہ دیا اور واجب الاحترام جانا۔ لیکن یہ افسوس ناک بات تھی کہ آپ **صلی اللہ علیہ والہ وسلم** اور پھر خلفائے راشدین کے بعد اسلام میں ملوکیت در آئی۔ شہنشائی انداز حکومت کی خلافت میں

عورت پھر مظلوم، مقید نشانِ تذلیل بن گئی اور یہ جنس پھر مردوں کی ملکیت قرار پائی۔ وہی اسلام جو ایک انقلابی مذہب بن کر دنیا بھر میں پھیل رہا تھا اس کے ماننے والوں نے اس روشن مذہب کو دُھندلا دیا اور اس کی اصل روح سے جدا کر دیا۔

آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی اسلامی دنیا کی عورتوں کو وہ مقام اور رتبہ میسر نہیں جس کا حقدار انہیں اسلام نے ٹھہرایا تھا۔ ایک عام تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ جن معاشروں نے اسلام قبول کیا وہ عورتوں کی اپنے حقوق کے لئے جدوجہد سے نا آشنا ہیں اس تاثر کی جڑ اس غلط فہمی میں پنہاں ہے کہ عہد حاضر کی خواتین کی جدوجہد محض یورپی اور امریکی نظریات رکھنے والے علاقوں اور معاشروں میں انیسویں صدی اور پھر بیسویں صدی میں ہونے والی خواتین کی جدوجہد پر مبنی ہے۔

اس تاثر کو مسلم تناظر اور اس سے قطع نظر دونوں جگہوں پر صحیح سمجھا جاتا ہے۔ مسلمان معاشرے میں تو یہ تاثر اس لئے پھیلایا جاتا ہے کہ خواتین کے حقوق کے لئے کام کرنے والوں اور ان کے نصب العین کو مشکوک بنایا جائے۔

اگر اس تاثر کو درست سمجھ لیا جائے تو پھر یہ بسا اوقات حقوق کے حوالہ سے مباحثہ سے لاتعلقی ظاہر کرتا ہے۔ خواتین کی جانب سے اپنے حقوق اور انصاف کی ہر صدا کی راہ روک دیتا ہے۔ اس کے برعکس سچ تو یہ ہے کہ عورتوں نے ہر زمانہ اور ہر خطے میں اپنے حقوق کے حصول کے لئے آواز بلند کی ہے۔ اور ایک آئیڈیل، منصفانہ معاشرے کی تشکیل کے لئے جدوجہد کی ہے۔ اپنے معاشی حقوق اور معاشرتی حقوق کے لئے آواز اٹھانے والی خواتین کا تعلق آٹھویں صدی سے اکیسویں صدی تک کے عرصہ پر محیط ہے۔

مسلم ممالک کی خواتین نے انسانی حقوق کی پامالی کرنے والے معاشروں، ملکوں کے خلاف جدوجہد کی ہے اور آج بھی بہت سے ممالک میں یہ آوازیں اُٹھ رہی ہیں۔

''لیبیا میں انسانی حقوق کی علمبردار چالیس سالہ ''رم'' کا کہنا ہے

''ہم نے ایک طاقتور شخص کے خلاف جدوجہد اس لئے نہیں کی

تھی کہ ہم خواتین ایک ظالمانہ نظام کے تحت زندگی گزاریں۔'' اس کی وجہ یہ ہے کہ لیبیا میں ایک سے زیادہ شادیاں کرنے پر پابندی تھی، اس کے بارے میں موجودہ حکومت کا کہنا ہے کہ ''شادی اور طلاق کا یہ قانون شریعت سے متصادم ہے اس لئے اسے ختم کر دیا گیا ہے۔ لیبیا میں تمام قوانین کی بنیاد اسلامی شرعی قوانین کو بنانے کا اعلان کیا گیا جس نے خواتین میں بہت سے تحفظات کو جنم دیا''۔

تیونس میں ترقی پسندوں اور اسلامی جماعتوں نے مل کر جمہوریت اور انسانی حقوق کے لئے جدوجہد کی۔ عرب ممالک میں اٹھنے والی مظاہروں کے ''سونامی'' میں اگرچہ ہر طرح کی سوچ رکھنے والے افراد اور سول سوسائٹی کے لوگوں نے حصہ لیا۔ مگر اب ان ممالک میں خواہ وہ لیبیا ہو یا تیونس، مصر ہو یا عراق انتہا پسند اسلامی گروپ زیادہ طاقتور ہو رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے انسانی حقوق اور خصوصاً خواتین کے حقوق کے لئے ایک طرح سے جنگ شروع ہوگئی ہے۔

عرب ممالک میں عورتوں میں اجتماعی بیداری پیدا ہوئی ہے۔ اب وہ پر جوش طریقے اور باہم اپنے اسلامی حقوق کو حاصل کرنے کے لئے برسر پیکار نظر آرہی ہیں۔

سعودی عرب میں انتخابات میں حصہ لینا ہو یا پھر ڈرائیونگ کا مسئلہ ہو۔ عراق میں کم سنی کی شادی یا پھر بیوی کی اجازت کے بغیر دوسری شادی ہو۔۔۔ قاہرہ، تیونس اور یمن میں بھی کچھ ایسے مناظر ہیں جہاں تبدیلی کی ہر لہر میں نئی توانائی اور قوت میں اضافہ ہو رہا ہے۔

''پاکستان عورت بھی اپنے دین سے بے پناہ محبت کے باوجود عورت پر ظلم، تشدد اور استحصالی اور دقیانوسی معاشرہ کو تسلیم کرنے سے انکاری ہیں جہاں عورت کا استحصال ہو رہا ہو''۔

ہم اگر یہ جانتے ہیں کہ جمہوریت ایک عوامی قانون ہے جس کا اطلاق لوگ اپنے ووٹ سے کرتے ہیں تو پھر یہ بات انتہائی حیران کن اور پریشانی کا باعث ہے کہ چند مخصوص عناصر غیر جمہوری طریقے سے اپنی سوچ اور نظریات کو قانون کی شکل کیونکر دینا چاہتے ہیں۔ جن قوانین کو اسلامی اور شریعت کے عین مطابق کہا جاتا ہے وہ ہر اسلامی ملک میں یکساں کیوں نہیں؟ اور یہ بات اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ وہ قوانین خدا کے بنائے ہوئے، نہیں بلکہ انسانوں نے اپنے مفادات کیلے بنائے ہیں۔

مسلم خواتین کو ظاہری جمہوریتوں اور بے قاعدہ مذہبی قوانین نافذ کرنے والے معاشروں کے خلاف تبدیلی کی تحریکیں چلانا ہوں گی۔

مسلمان عورتیں باوقار طریقہ سے اپنے اسلامی حقوق کے لئے بیدار ہو رہی ہیں۔ ان کا جوش اور مثبت تبدیلی کے لئے قربانی کا جذبہ سارے پیمانوں اور امتحانوں پر پورا اُتر رہا ہے۔

☆☆☆☆☆

خواتین کی عالمی کانفرنسیں

''بین الاقوامی سطح پرخواتین کے حقوق کیلئے منعقد ہونے والی کانفرنسوں کا سلسلہ اقوام متحدہ کے وجود میں آنے کے بعد اس کے بنیادی منشور کا حصہ ہیں۔اقوام متحدہ کے چارٹر کے مطابق دنیا سے غربت اور جہالت کا خاتمہ، بنیادی انسانی حقوق کی پاسداری اور دنیا کے تمام ممالک کے شہریوں کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنا ہی درحقیقت اقوام متحدہ کے بنیادی مقاصد ہیں۔'' (۱)

''انہیں مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے 26 جون 1945ء کے فوراً بعد انسانی حقوق کے کمیشن کا وجود عمل میں آیا اس کمیشن کے قیام کے صرف ایک سال بعد ہی بین الاقوامی سطح پرخواتین کے ایک کمیشن کا قیام عمل میں آیا۔اقوام متحدہ کے کمیشن ''وومن رائٹس کمیشن'' کے مقاصد بالکل وہی تھے،جن کا پرچار یورپ میں فرانسیسی انقلاب کے بعد شروع ہونے والی (FEMINIST) تحریک یا آزادی نسواں تحریک کے علمبردار کرتے آئے تھے۔اسی تحریک کے بنیادی نکات کی روشنی میں اقوام متحدہ کے کمیشن برائے حقوق نسواں کے مقاصد کا تعین کیا گیا جس کا سب سے بڑا نعرہ عورتوں کے لئے مردوں کے مساوی حقوق اور

خواتین سے امتیازی سلوک کا خاتمہ تھا۔''(۲)

اس کمیشن نے اپنے وجود میں آنے کے بعد یورپی ممالک میں تو اپنی آواز پہنچادی تھی مگر پوری دنیا میں عورتوں کے حقوق کا صیح معنوں میں تصور دینا ایک اہم اور ناگزیر امر تھا۔ 1960ء کا عشرہ عورتوں کے حقوق کے حوالے سے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ 1960ء سے 1970ء تک کا حصہ Feminiset تحریک کے عروج کا زمانہ ہے اس عرصہ میں عورتوں کے مسائل اور حقوق کے حوالے سے آواز اٹھائی گئی، اور انہیں بین الاقوامی سطح پر منظر عام پر لایا گیا۔

میکسیکو 1975ء

1972ء فروری میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 1975ء کے سال کو ''خواتین کا عالمی سال'' قرار دیا اور یوں 1975ء میں میکسیکو میں خواتین کی عالمی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ اس عالمی کانفرنس کے مقاصد مندرجہ ذیل تھے۔

1- عورتوں اور مردوں کے درمیان برابری کو پروان چڑھانا اور وسعت دینا۔

2- ترقی کی راہ میں عورتوں کی بھرپور شرکت کو یقینی بنانا۔

3- بین الاقوامی امن وسلامتی کے فروغ میں خواتین کی شرکت میں اضافہ کرنا۔

اس کانفرنس میں پہلی بار عالمی برادری کو یہ بتایا گیا کہ دنیا بھر کے بہت سے ممالک میں عورتوں کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ جو بتدریج ایک گھمبیر مسئلے کی شکل اختیار کرتا جارہا ہے۔ اس کانفرنس میں خواتین نے اپنے حقوق کے بارے میں آگہی دینے کی تجاویز پیش کہیں۔ مثلاً

1- Universal, Declaration of humain Rights, united National department of Public Information.

1- تعلیم

2- طبی سہولیات کی فراہمی

3- سیاست میں عورتوں کی شمولیت

اوراس طرح کے دیگر مطالبات

کانفرنس کے مطالبات کی روشنی میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 1975ء سے 1985ء تک عورتوں کا عشرہ منانے کا اعلان کر دیا۔

''اس کے بعد خواتین کی ترقی اور حقوق کی بحالی کا ایک نیا دور عالمی افق پر نمودار ہوا۔ اس عمل کے نتیجہ میں عورتوں کی الگ حیثیت سے متعلق مباحثے منعقد کروائے گئے۔ مقاصد کے تعین اور ان مقاصد کی راہ میں درپیش مسائل کی نشان دہی کی گئی اور حقوق نسواں سے متعلق پیش رفت کا جائزہ لیا گیا''۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے یہ کانفرنس عورتوں کی ترقی اور حقوق کی بحالی کے لئے عالمی دنیا کی توجہ مبذول کروانے کے لئے منعقد کرائی تھی تا کہ حالات کا ادارک کرنے کے بعد بہترین حکمت عملی اپنائی جائے۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے مقاصد کے حصول کے لئے تین اہم اہداف کی نشاندہی کی جنہیں عورتوں کے بارے میں اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کی بنیاد کہا جاتا ہے۔

1- میکسیکو کانفرنس کے اجلاس کے موضوعات تشکیل دینے میں عورتوں نے اہم کردار ادا کیا۔ اس کانفرنس میں 133 ممالک کے وفود نے شرکت کی جن میں سے 113 ممالک کے وفود کی سربراہی خواتین کر رہی تھیں۔

''خواتین کے عالمی سال نے اقوام متحدہ کو خواتین بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ایک لائحہ عمل ترتیب دیا۔ خواتین کا عالمی سال خواتین کی کانفرنسز کے مسلسل انعقاد میں بے حد

معاون ثابت ہوا۔ ان کانفرنس میں خواتین کی ترقی ، سلامتی اور مساویانہ سلوک سے متعلق ''گلوبل پالیسی ڈاکومنٹس'' پر توجہ مرکوز کی گئی''۔

2- کوپن ہیگن کانفرنس

یہ کانفرنس **1980**ء میں کوپن ہیگن میں منعقد ہوئی ۔ یہ عورتوں کے بارے میں دوسری عالمی کانفرنس قرار پائی ۔اس کانفرنس میں، میکسیکو کانفرنس میں جو عالمی لائحہ عمل تشکیل دیا گیا تھا۔ اس کا جائزہ لیا گیا۔ اس کانفرنس میں **145** رکن ممالک کے نمائندگان نے شرکت کی ۔کانفرنس میں تجزیہ کیا گیا کہ میکسیکو سٹی کانفرنس کے مقاصد حصول بہترین طریقے سے ہوجانے کے باوجود حقوق نسواں کے حصول اور استعمال کے بارے میں عورتوں کی صلاحیت میں فرق کے آثار ظاہر ہوئے ہیں۔اس مسئلہ کے حل کے لئے کانفرنس نے تین شعبوں میں بھرپور اقدام کرنے کے بارے میں نشان دہی کی۔ یہ تین شعبے درج ذیل ہیں۔

1- تعلیم

2- روزگار

3- علاج معالجہ

کانفرنس میں اس بات کو اجاگر کیا گیا کہ ان تینوں شعبوں تک خواتین کی یکساں رسائی ضروری ہے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ کوپن ہیگن کانفرنس کے اجلاس بھی سیاسی کشیدگیوں کے تناظر میں ہوئے ۔اس بات کا ذکر بھی بہت ضروری ہے کہ اگر چہ کانفرنس کا اختتام عملی پروگرام یا عملی لائحہ عمل کی منظوری سے ہوا لیکن یہ لائحہ عمل اتفاقِ رائے سے منظور نہ ہوسکا۔اس کانفرنس میں عورتوں کے قانونی حقوق اوران کے استعمال اور استفادہ کے سلسلہ میں خواتین کی صلاحیتوں میں کمی اور فرق کے اسباب کو سامنے لایا گیا۔

1- معاشرے میں عورتوں کا کردار بہتر بنانے کے پروگرامز میں مردوں کی مناسب

شمولیت کا فقدان۔

-2 غیر مناسب سیاسی عزائم اور ارادے۔

-3 معاشرے میں عورتوں کے کردار کی اہمیت تسلیم کرنے کا فقدان

-4 منصوبہ بندی میں عورتوں کی ضروریات پر نامناسب توجہ

-5 فیصلہ سازی کے عمل میں اہم عہدوں پر خواتین کا نہ ہونا

-6 امداد باہمی ۔ ڈے کیئر سنٹرز اور قرضوں کی سہولتوں جیسے قومی زندگی کے شعبوں میں عورتوں کے کردار کی حمایت کے لئے نامناسب سروسز۔

-7 ضروری مالیات اور وسائل کی عدم دستیابی

-8 عورتوں کو میسر مواقع کے بارے میں ان میں لاعلمی کا عنصر

اس کانفرنس میں حقوق نسواں کے لئے موثر مکمل اقدامات پر زور دینے کے ساتھ مندوبین نے عورتوں کے دقیانوسی اور روایتی رویوں کے خاتمے پر بھی زور دیا۔

اس کانفرنس میں دوسری مدت کے پلان آف ایکشن کا تعین کیا گیا اور مساوات کی تعریف کی گئی ۔ کہ مساوات کا مطلب فقط قانونی مساوات ہی نہیں بلکہ ترقی کی راہ میں برابر مواقع ، یکساں ذمہ داریاں اور بنیادی حقوق میں برابری لاتا ہے۔

خواتین کی عالمی کانفرنس 1985ء (نیروبی)

خواتین کی تیسری عالمی کانفرنس کینیا کے شہر نیروبی میں منعقد ہوئی ۔ اس کانفرنس میں تمام حاصل شدہ تجربات ، خواتین کی ترقی کی راہ میں حائل رکاوٹوں اور اقوام متحدہ کے ''عشرہ برائے خواتین'' کے نتائج کا جائزہ لیا گیا۔ اگرچہ میکسیکو کانفرنس میں متعین شدہ تمام اہداف کا حصول ممکن نہ ہو سکا تھا سب سے بڑی کامیابی یہ سامنے آئی کہ عالمی سطح پر خواتین کے مسائل کا ذکر ہوا۔ خواتین کی زندگی اور ان حالات پر معلومات کا بڑے پیمانے پر تبادلہ کیا گیا۔

اور ایک اہم قدم اس کانفرنس میں یہ اٹھایا گیا کہ ترقی کی تعریف خوبصورت انداز اور خواتین کے تناظر میں کی گئی۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے نیروبی کانفرنس میں عورتوں کے حقوق اور تحفظ اور ترقی کے لئے مثبت لائحہ عمل بنانے پر زور دیا اس بات کا فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ ہر پانچ سال بعد عورتوں کی ترقی کے جائزے کے لئے سروے کرائے جائیں۔

2- Nairobi forward Looking Strategies forth Advancemenit of woman united National. (page - 5)

N.G.O'S کا اس کانفرلس میں شرکت کا مقصد خواتین کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا نہیں تھا۔ بلکہ انہوں نے اقوام متحدہ کی دستاویزات کی تیاری اور حکومت کے ساتھ تنظیم سازی کا ایک نیا رخ متعین کیا۔ خواتین نے اپنے آپ کو منظّم کیا۔ اپنی حکومتوں سے ملیں اور ایسے ایشوز کو حکومت کے سامنے پیش کیا جن کے سلسلہ میں وہ ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کر رہی تھیں اور اپنے مسائل کے حل کے لئے نہ صرف مقامی سطح پر بلکہ بین الاقوامی طور پر عملی اقدامات کئے۔ مزید برآں این۔ جی۔ اوز کے نمائندے سرکاری کاروائی کی نگرانی کرنے اور حکومتی وفود سے زبان اور دوسرے ایشوز پر بات چیت کرنے کے لئے موجود تھے۔

این۔ جی۔ اوز کے اس تصور کو علاقائی یا بین الاقوامی منصوبہ بندی کی کمیٹیوں کے ذریعے این جی اوز نے فروغ دیا۔ اس مقصد کی بجا آواری اور فروغ کے لئے سیمنارز، لیکچررز، ورکشاپ، نمائش، مظاہرات، اجلاس، تھیٹر، کنسرٹ اور دوسرے آرٹ کے ذرائع کو استعمال کیا۔

''نیروبی کانفرنس عورت کے مساوی حقوق اور ان سے متعلق اقوام متحدہ کے خواتین سے متعلق عشرے کی کامیابیوں کا جائزہ لینے کے لئے منعقد کی گئی ۔ اس میں غیر سرکاری تنظیموں کے

15000 نمائندے شریک ہوئے۔اس کانفرنس کو بیشتر شرکاء نے عورتوں کے مساورانہ حقوق کے لئے عالمی تحریک کا نکتہ آغاز قرار دیا۔ دلچسپ بات یہ رہی کہ میکسیکو کانفرنس میں عالمی اقتصادی اور سیاسی صورت حال کی وجہ سے جو اختلافات کشیدگی اختیار کر چکے تھے۔ان دس برسوں کی محنت کے بعد ترقی ۔مساوات اور امن کے پرچم تلے ایک متحدہ بین الاقوامی قوت بن گئے ،لیکن اعداد وشمار کی روشنی میں تجزیہ کرنے پر یہ بات سامنے آئی کہ کوپن ہیگن کانفرنس کے بعد عورتوں کے حقوق کے لئے کئے جانے والے اقدامات ناکافی ثابت ہوئے ۔اس کانفرنس میں شرکاء نے یہ محسوس کیا کہ اہداف کے حصول کے لئے نئی حکمت عملی طے کرنے کی ضرورت ہے۔گذشتہ صدی کے اوخر تک کے لئے ایک ترقی پسندانہ حکمت عملی طے کی گئی اور شرکاء نے اس کو اتفاق رائے سے منظور کرلیا۔اس دستاویز میں کہا گیا کہ ''تمام مسائل عورتوں کے ہی مسائل ہیں''(۳)

اس کانفرنس میں تمام انسانی معاملات کے حل اور فیصلہ سازی کے سلسلے میں خواتین کی شرکت کو سیاسی اور سماجی ضرورت قرار دینے کے علاوہ ان کو خواتین کا جائز حق تسلیم کیا گیا۔اقوام متحدہ کی جانب سے شائع کردہ کتاب ''خواتین اور **2000**'' نامی دستاویز میں جن میں بنیادی اقدامات کی نشان دہی کی گئی ہے وہ درج ذیل ہیں۔

1- آئینی اور قانونی اقدامات

2- سماجی شرکت میں مساوات

3- سیاسی شرکت اور فیصلہ سازی میں مساوات

''یہاں یہ امر نہایت اہم ہے کہ چونکہ اس کانفرنس میں تمام مسئلوں کو عورتوں کے مسائل قرار دیا گیا تھا۔لہٰذا اس ترقی پسندانہ دستاویز

میں روزگار، صحت، تعلیم، سماجی بہبود سے لے کر سائنس، صنعت مواصلات اور ماحول تک ہر شعبہ میں اقدامات کی سفارش کی گئی۔ بعد ازاں اس کانفرنس کی دستاویزات کی پیروی کرتے ہوئے جنرل اسمبلی نے اقوام متحدہ سے کہا کہ عالمی ادارے کے تمام شعبوں میں عورتوں کے مسائل سے متعلق مراکز قائم کیے جائیں۔

(۴)''

3- Nairobi Forward Looking Starategies forthe Advancement of women Nation. (P-5)

(خواتین 2000ء اقوام متحدہ، صفحہ:.....4)

قاہرہ کانفرنس:

ستمبر 94 میں یو۔این۔او کی طرف سے قاہرہ میں بہبود آبادی کانفرنس کے نام سے ایک کانفرنس کا انعقاد ہوا اس کانفرنس میں اقوام متحدہ کی کاوشوں کا جو عورتوں کے حقوق کے لئے کی گئیں ذکر کیا۔ اور اس کانفرنس میں عورتوں کے حقوق کو انسانی حقوق قرار دیا گیا، اور اس بات پر زور دیا گیا کہ رکن ممالک عورت کو ممکنہ حد تک مرد کے مساوی حقوق دیں۔

''پچھلی تمام کانفرنس میں پیش کی جانے والی تمام قراردادوں کے علاوہ جو نئے امور قابل غور ہیں ان میں عورتوں کو روزگار کی با آسانی فراہمی اور عورتوں پر تشدد کا خاتمہ شامل تھا۔'' (۵)

کانفرنس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ قوانین اور اصول وضوابط کے تحت ان تمام باتوں پر عمل کرنے کے لئے رکن ممالک فی الامکان جدوجہد کریں۔

5- Except from the Cairo Conforence for Health and development, British Councial Lahore.

☆☆☆☆☆

بیگم مہناز رفیع.....سیاسی جدوجہد کی تاریخ

محترم بیگم مہناز رفیع پاکستان کے سیاسی، سماجی اور اشرافیہ کے طبقہ میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ ہماری سیاسی تاریخ میں بہت کم خواتین ایسی ہیں جنھوں نے نامساعد حالات کے باوجود اپنے سیاسی، سماجی وجود اور ساکھ کو نیک نامی کے ساتھ اختیار کیا ہوا ہے۔ پاکستان، اسلام، جمہوریت اور انسانی قدروں پر یقین رکھنے والی مہناز رفیع صاحبہ اپنے ایک مخصوص خیالات وافکار کے باوجود ہر نقطہ نظر کے لوگوں میں اپنے ہونے اور اہمیت کا احساس دلاتی ہیں۔ یہ بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے کہ کوئی بھی فرد ہمہ گیر شخصیت کا مالک ہو، مہناز رفیع کو اللہ تعالیٰ نے یہ ملکہ عطا کیا ہے کہ وہ بیک وقت سیاسی اور سماجی دونوں حلقوں میں ایک فعال کردار کے ساتھ مصروف عمل نظر آتی ہیں۔ پاکستانی سیاست اور سیاسی شخصیات کے بارے میں لوگوں کا مجموعی تاثر کوئی بہت اچھا نہیں، لیکن مہناز رفیع ان باوقار شخصیات میں شمار ہوتی ہیں جو دور حاضر میں خال خال نظر آتی ہیں۔ وہ شخصیت پرستی کے اس خول میں قید نہیں جو آج ہماری سیاست کا خاصہ ہے۔ وہ صاحبان اقتدار کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے یا شاہ سے زیادہ شاہ کی وفاداری کا بھرم رکھنے کی بجائے جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق ادا کرنے کو ترجیح دیتی ہیں۔ مہناز رفیع کی جملہ قابل فخر اور قابل رشک کامیابیاں کسی وراثتی ترکہ کا حصہ نہیں ہے، بلکہ زمانہ طالب علمی سے ہی بھرپور سیاسی، سماجی شعور سے بہرہ مند ہو

چکنے کے برتے پر ایوبی آمریت کی مذمت، مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت اور ضیائی مارشل لا کے کمبل سے برامد ہونے والی منافقانہ پالیسیوں اور بالخصوص ان کی عورتوں کے خلاف قانون سازی کا پردہ چاک کر کے آج اہم سیاسی، سماجی مقام پر فائز ہیں۔ مہناز رفیع میں اپنی بات کا سلیقہ مندی، شائستگی اور شستگی سے پیش کرنے کی صلاحیت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ پاکستانی سیاست میں اہمیت دیتی ہیں۔ سب سے زیادہ لائق تحسین ان کا سیاسی وصف یہ ہے کہ وہ سیاسی جماعتوں کے اندر حقیقی جمہوری کلچر کے قیام کی علمبردار ہیں۔ بنیادی جمہوری اداروں یعنی مقامی حکومتوں کے نظام اور اس نظام میں عورتوں کی 33 فیصد نمائندگی کو یقینی بنانے میں ان کی سیاسی کمٹمنٹ اور جدوجہد بھی ہماری سیاسی تاریخ کا ناقابل فراموش حصہ ہے۔ میں نے انھیں ہمیشہ قائداعظم محمد علی جناح، فاطمہ جناح، نظریہ پاکستان کی فکری بنیادوں کے قریب تر دیکھا ہے۔ کیونکہ ان کا مشن وطن عزیز میں خواتین کی سیاسی جدوجہد کو تیز تر کرنا ہے۔

وہ بنیادی طور پر مکالمہ کی عورت ہیں اور ہر طرح کی سیاسی، سماجی انتہا پسندی کے نہ صرف وہ خلاف ہیں، بلکہ اس کے خاتمے کے لیے برسر پیکار ہیں۔ میں انھیں ذاتی طور پر ایک سیماب صفت سیاسی، سماجی کارکن کے طور پر جانتا ہوں۔ کیونکہ وہ آسانی کے ساتھ نہ سمجھوتے کی حامی ہیں اور نہ ہی کسی ایسی سیاست کے ساتھ خود کو جوڑتی ہیں جو مفاداتی سیاست کا حصہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ کئی جماعتوں کا حصہ بنی رہیں، لیکن حیرت انگیز طور پر اقتدار کی سیاست کے اوپر قومی سیاست حاوی رہی ہے۔ بہت سے لوگوں میں ان کی حیثیت ایک سیاسی ورکر کی سی ہے، لیکن مجھے تو انھیں سیاست کے علاوہ سول سوسائٹی بالخصوص انسانی حقوق، عورتوں، بچوں، اقلیتوں اور محروم طبقات کے مسائل کے حل کے لئے کوشاں دکھائی دیتی ہیں۔ وہ ملکی اور بین الاقوامی فورمز پر پاکستان کا مقدمہ لڑنے والے سیاسی، سماجی وکیلوں میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔

رکن قومی اسمبلی کی رکن بن کر بہترین خاتون پارلیمنٹرین کہلانے کا شرف حاصل

کیا۔ ملک میں تحریک ترقی نسواں کی باگ ڈور سنبھالنے میں ان کا کردار کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ آج وہ پارلیمنٹ کا حصہ نہیں ہیں، مگر دیگر ہم عصر خواتین پارلیمنٹرین کی نسبت کئی گنا زیادہ متحرک دکھائی دیتی ہیں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ موصوفہ ہمہ وقت ہمہ جہت مقاصد کے تعاقب میں مگن دکھائی دیتی ہیں۔ یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ جہاں اور بہت سی صلاحیتوں کی مالک ہیں وہیں وہ ایک اچھی مصنفہ بھی ہیں۔ ان کی تحریریں ہم مختلف قومی اخبارات میں پڑھتے رہتے ہیں۔ ان کا تازہ شغف ان کی تصنیف **''سفر''** ہے۔ اس تصنیف میں ان کے وہ تمام سیاسی اور سماجی موضوعات پر لکھے جانے والے مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد یہ احساس اور پختہ ہوتا ہے کہ ان کی ان مسائل پر کمٹمنٹ قابل داد ہے۔ وہ ان تحریروں میں نہ صرف مسائل کا احاطہ کرتی ہوئی نظر آتی ہیں بلکہ وہ مسائل کا حل بھی پیش کرتی ہیں۔ ان کی یہ تحریریں ایک ایسے سیاسی، سماجی کارکن کی ہے جس نے عملی طور پر ان تمام نشیب فراز کو دیکھا ہے جو ہماری سیاست اور سماجیات کو پچھلی کئی دہائیوں سے درپیش ہیں۔ میں انھیں ان کی اس شاندار کاوش پر دل کی گہراہیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ سیاست کے ساتھ ساتھ ان کا قلم کے ساتھ تعلق کا یہ سلسلہ بدستور جاری رہے گا۔ کیونکہ میرا یہ یقین ہے کہ وہ فرد جو کسی بھی شعبے میں عملی طور پر جدوجہد کا حصہ ہو اس کے تجربات سے فائدہ اٹھا کر ہی ہم معاشرے کی فکری تشکیل میں بڑا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے مہناز رفیع جیسے لوگ ہماری قومی سیاست اور سماجی ترقی کے لیے کل بھی ضروری تھے، اور آج کے حالات میں ان جیسے لوگوں کی کئی گناہ زیادہ ضرورت ہے۔

سلمان عابد

4 جنوری 2013 لاہور

☆☆☆☆☆

''حقوق کی جنگ، مسلمانوں عورتوں کا کردار''

مورخوں کی بددیانتی اور محققوں کی غلط تحقیق نے مسلمان ممالک کی خواتین کے بارے میں یہ تاثر بیدار کیا ہے کہ مسلمان خواتین نے کبھی اپنے حقوق کے لیے جدوجہد نہیں کی۔

خصوصاً ضیاء الحق کے سیاہ دور میں خواتین کے لئے بہت بھیانک قوانین بنائے گئے اور انہیں سماجی، سیاسی اور معاشرتی لحاظ سے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی گئی۔ یہ امر سراسر غلط، قائد اعظم کی سوچ اور فکر سے متصادم اور اسلامی اور آئینی لحاظ طور سے بھی غلط تھا۔

اسلام کی غلط تشریح کرتے ہوئے، عورتوں کو چادر، چار دیواری میں مقید کرنے ملکی سطح پر حکومتی مہم نے کام کیا۔۔۔۔۔

اس دور میں چند این۔جی۔اوز اور کثیر تعداد میں ان خواتین نے جو یہ جانتی تھیں کہ اسلام نے کبھی مرد اور عورت کے درمیان فرق روا نہیں رکھا، یہ محض جاگیردارنہ اور قبائلی معاشرے کا شاخسانہ ہے۔ جو خواتین کو ان کے حق سے محروم کرنے کے لئے مذہب کو استعمال کررہا ہے۔ یہ خواتین ہم آواز ہوگئیں اور ''ویمن ایکشن فورم'' پر اکھٹی ہوئیں اور احتجاج کا نعرہ بلند کیا۔ یہ بلند ہمت خواتین تمام امتیازی خواتین سے منکر تھیں۔ جیسے کہ ''قانون شہادت''۔ ''دیت اور قصاص''۔ ''حدود آرڈیننس''۔

ان خواتین کی کردار کشی کی گئی اور انہیں مغرب زدہ'' عورتیں کہا گیا۔ اور مزید یہ کہ ان کو مغربی ممالک فنڈ دیتے ہیں۔ یہ خاندانی نظام کو ختم کرنا چاہتی ہیں۔ اور یہ مذہب کے بارے میں لاعلم ہیں۔

مگر حکومت میں بیٹھے اور حکومت سے باہر ''مخصوص گروہ'' کے لوگ اس وقت ناکام ہو گئے ۔ جب عورتوں عین اسلام کے مطابق حقوق کے حوالے سے بات کی ۔ کچھ اسلامی اسکالرز نے خواتین کے موقف کی تائید کی اور لکھا کہ ''اسلام مرد اور عورتوں کے لیے یکساں قوانین رکھتا ہے۔ اور نہ ہی عورتوں کو کمتر سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ اسلامی معاشرے میں خواتین نے تقریباً ہر دور میں ''لیڈر شپ'' کا مظاہرہ کیا ہے اور ''رول ماڈل'' رہی ہیں۔ جیسا کہ حضرت بی بی عائشہ، حضرت بی بی زینب، بی بی رابعہ بصری۔ اور بہت سی عورتیں.....۔

خواتین نے ہر دور اور ہر خطہ میں اپنے حقوق اور انصاف کے حصول کے لئے جدوجہد کی ہے اور ایک منصفانہ معاشرے کی تشکیل کے لئے اقدامات کیے۔ یہ بات مسلم معاشرے اور غیر مسلم معاشرے میں یکساں ہے۔ شرکت گاہ'' نے ایک تحقیقی کتاب ''نقش دوام'' میں ''خواتین زیر اثر مسلم قوانین'' کے حوالے سے زبردست تحقیق کی ہے۔

اس کتاب میں اوائل اسلام سے لے کر بیسویں صدی تک مسلمان خواتین کی اپنے حقوق کے لئے ہونے والی جدوجہد کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ جس سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ مسلم خواتین نے اپنے حقوق کے لئے ''جنگ'' نہیں لڑی۔ بلکہ یہ ماضی کی مختلف تصویر پیش کرتی ہے۔ اور اس تاثر کی بھی نفی ہوتی ہے کہ عورتیں بے زبان اور ہمہ وقت سر تسلیم خم کرنے والی مخلوق ہیں۔

''نقش دوام'' ان عورتوں کے بارے میں نہیں جن کو تاریخ میں طاقتور عورتوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بلکہ ان خواتین کا تذکرہ ہے جنہوں نے عورتوں کے حقوق اور سماجی انصاف کے لئے جدوجہد کی۔ ان خواتین کی اپنے حقوق کے حصول کے لئے لگن تین دھاروں میں بٹی دکھائی دیتی ہے۔ ایک وہ خواتین ہیں جنہوں نے اپنی ذات کے حوالے سے اپنے خاندان میں اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کی ___ دوسری، وہ عورتیں ہیں جو اپنی ہم جنسوں کے لیے جدوجہد کرتی رہیں۔ تیسرا دھارا اپنے معاشرے کو خواتین دوست بنانے کے لئے خواتین کی کوششوں پر مشتمل ہے۔ ابتداء میں خواتین کی شمولیت حصول علم کے لئے ہوئی اور مزید یہ کہ معمولات حکومت چلانے والوں پر اثر رسوخ کی وجہ سے ہوا۔ خواتین کا علم کے حصول کا سلسلہ بھی جاری وساری رہا جس کو خواتین کی تحریروں اور تعلیم کے لئے کی جانی والی کوششوں سے بھی سہارا ملا۔ کچھ خواتین نے نہ صرف حکمرانوں کی مشیر بن کر معاشرہ پر اثر ڈالا بلکہ کچھ خواتین خود

بھی حکمران بن گئیں۔

دسویں صدی کے اواخر میں اس بات کے آثار ملتے ہیں کہ خواتین نے علم وادب اور تصوف سے ہٹ کر دیگر معاملات میں اپنی رائے کے اظہار کا سلسلہ شروع کیا۔ دوسری طرف اپنی ذاتی زندگیوں میں بہتر مقام اور حقوق کے لئے کوششیں شروع کیں۔ ان کوششوں کو تقویت حکمران خواتین کی بنا پر ملی جنہوں نے اپنے اختیارات اور قوت پر زور دیا۔ اور مجموعی طور پر اپنے عہد، معاشرے اور خواتین کے حالات کو بہتر بنایا۔ اس طرح کچھ خواتین نے تحریر کو ذریعہ اظہار بنایا اور دوسری خواتین کے حقوق کی پاسداری کے لئے کام کیا۔

گیارہویں صدی کی ابتدائی دو دھائیوں میں قاہرہ کے خلیفہ الحاکم بن امری اللہ نے ظلم وستم کا بازار گرم کیا تو انتہائی نامساعد حالات میں خواتین نے خلیفہ کے احکامات کے خلاف آواز بلند کی۔ ''نجات کی گھڑی'' کی صورت میں اس کی ''بہن تسط الملک'' آتی جو ہمہ مقتدر خاتون کے نام سے جانی گئیں۔ وہ 1021ء تا 1024ء تک ولی یا قائم مقام حاکم کے طور پر اپنے فرائض ادا کرتی رہیں۔ انہوں نے بھائی کیمجنونانہ انداز کو ترک کیا۔ معیشت کی بحالی کے لیے اہم کردار ادا کیا اور مذہبی رواداری کو فروغ دیا۔

مسلم عربوں کی تاریخ میں کم عورتیں حکمران رہی ہیں۔ تاہم گیارہویں صدی میں یمن کے ''صلاحیہ'' خاندان کی دو عورتیں یکے بعد دیگرے حکمرانی کے درجہ پر فائز ہوئیں۔ اسما بنت شہاب العلامیہ اور پھر ان کی بہو ''عروہ بنتِ احمد'' ان کی جانشین ٹھہریں، جنہوں نے نہ صرف پچاس برس تک حکومت کی بلکہ ملکوں کی تاریخ میں ایسی مثال نہیں ملتی۔ ان کو ''صلاحیہ یمن'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

خلیفہ محمد المستقنی جلا'' کی بیٹی ''ولادا'' نے شاعری میں نام پیدا کیا۔ انہوں نے شادی نہیں کی۔ انہیں بے حد توقیر اور مرتبہ ملا۔ ان کی شاعری انسانی حقوق سے تعلق رکھتی تھی۔ ''ولادا'' اجلاس منعقد کرتیں جن میں مرد وخواتین کے مسائل پر بحث ومباحثہ ہوتا، یہ سعی ادب کے فروغ میں بھی معاون ثابت ہوئی۔

مصر کی ''مریم اُم حانی'' کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ انہوں نے برسوں مرد وخواتین کو حدیث کا درس دیا۔ ''فاطمہ عالیہ خانم'' ترکی کے دور اصلاحات میں اس وقت سرگرم ہوئیں، جب خواتین کی ترقی اور جدیدیت کے متعلق منصوبوں کے حوالے سے عورتوں

کے مسائل قومی سطح پر سامنے آئے۔ فاطمہ ترکی کی پہلی خاتون ناول نگار کا اعزاز رکھتی ہیں جنہوں نے تحریروں کے ذریعے عورتوں پر عائید پابندیوں اور کثیر الازدواج'' کے حوالے سے نکتہ چینی کی ، ان کی نظر میں عورتوں کے حقوق پامال کیئے جارہے تھے۔ بیسویں صدی کے آتے آتے عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ بہت اہمیت اختیار کر گیا۔ عورتوں نے اپنی قوانین کو بھی چیلنج کرنا شروع کیا جو غیر اخلاقی اور بے رحم تھے۔

ہندونوفل سرگرم عرب خواتین کے جھرمٹ کا ایک روشن ستارہ تھی۔

برصغیر پاک وہند میں تعلیم اور عورتوں کے حقوق کی علمبردار خواتین کا ذکر نہ کرنا بہت بڑا جرم ہوگا۔ بھوپال کی بیگم سلطان جہاں ''انجمن خواتین اسلام کی سرپرست تھیں۔ بیگم محمدی زوجہ مولوی سید ممتاز علی جو ''تہذیب نسواں'' جیسے معیاری جریدے کی مدیرہ تھیں۔

رقیہ حسین ان کا تعلق بنگال سے تھا۔ جہاں آراء شاہنواز، رشیدہ جہاں، عطیہ فیضی عابدہ سلطان بھوپال کی باغی شہزادی تھیں۔ شائستہ اکرام اللہ، اماں بی، عصمت چغتائی جیسی عظیم خواتین جنہوں نے تحریر، سیاست اور خواتین کے حقوق کے لئے بڑے کام کئے۔ برصغیر کی یہ خواتین اور بہت سی خواتین جو ترکی، مصر اور عرب ملکوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ انہوں نے خواتین کے حقوق کی لڑائی لڑی۔

''نقش دوام'' نے تحقیق کے لئے تاریخ کی عمیق سمندر میں غوطہ لگایا' اور اس میں سے موتی نکال کے لائے ''یاد رکھو ہم انسان ہیں اور اپنے کام کے ذریعے دکھادو کہ عورتیں دنیا کا نصف ہیں۔

''سچ تو ہے کہ ہم اس دنیا کی خالق ہیں''

''بشکریہ شرکت گاہ''

بشکریہ فریدہ شہید، عائشہ ایل ایف شہید

☆☆☆☆☆



دبئ میں خواتین کے حوالے سے ایک ورکشاپ





جنرل اسمبلی اقوام متحدہ میں پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے



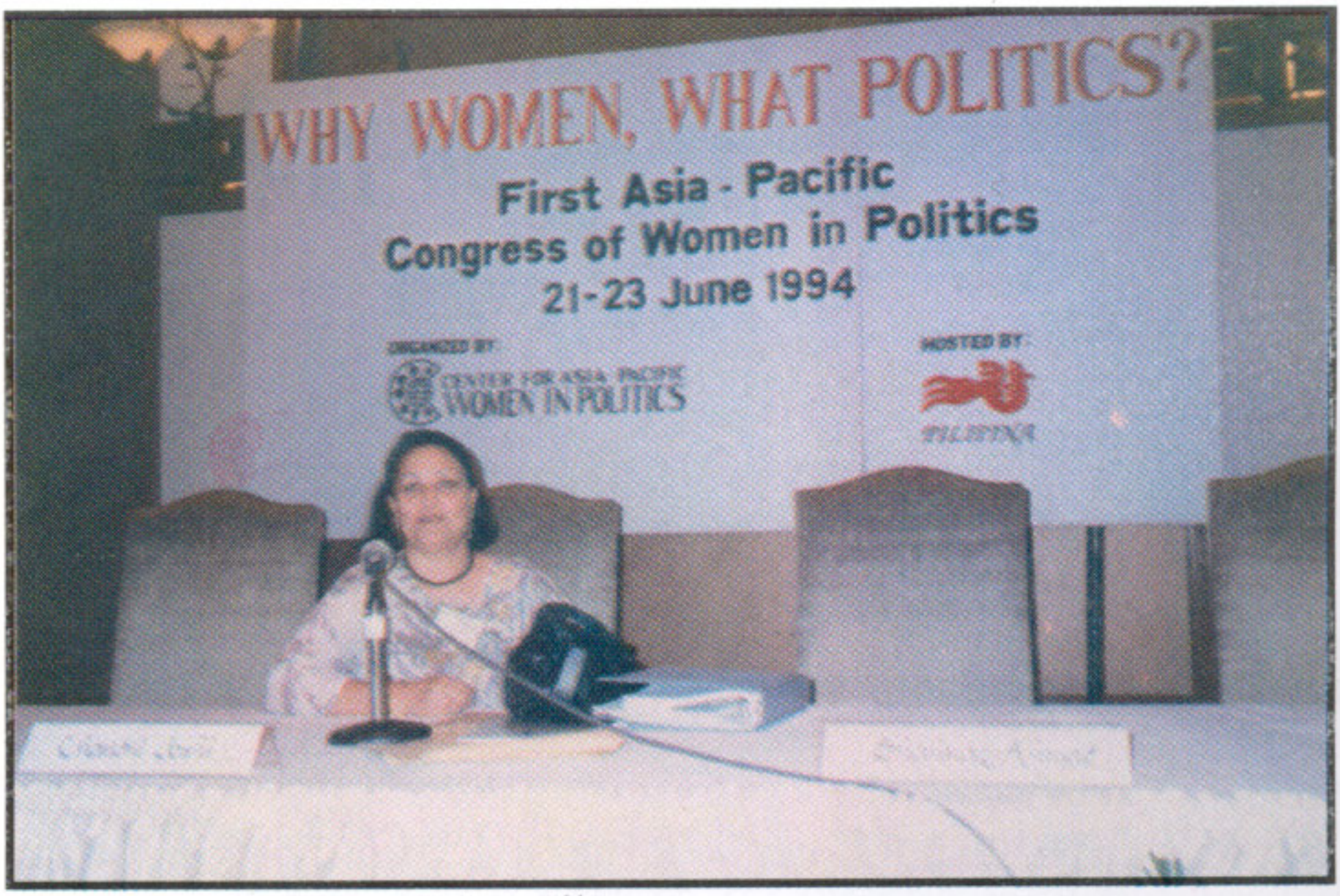
اسلامی انقلاب کی 10 ویں سالگرہ پر امام خمینی کی بیٹی کے ساتھ



روس میں خواتین کی عالمی کانفرنس



دیوار چین پر



فرسٹ ایشیاء پیسیفک کانگرس آف وومن ان پالٹیکس 23-21 جون 1994ء



کوریا کے دورے میں



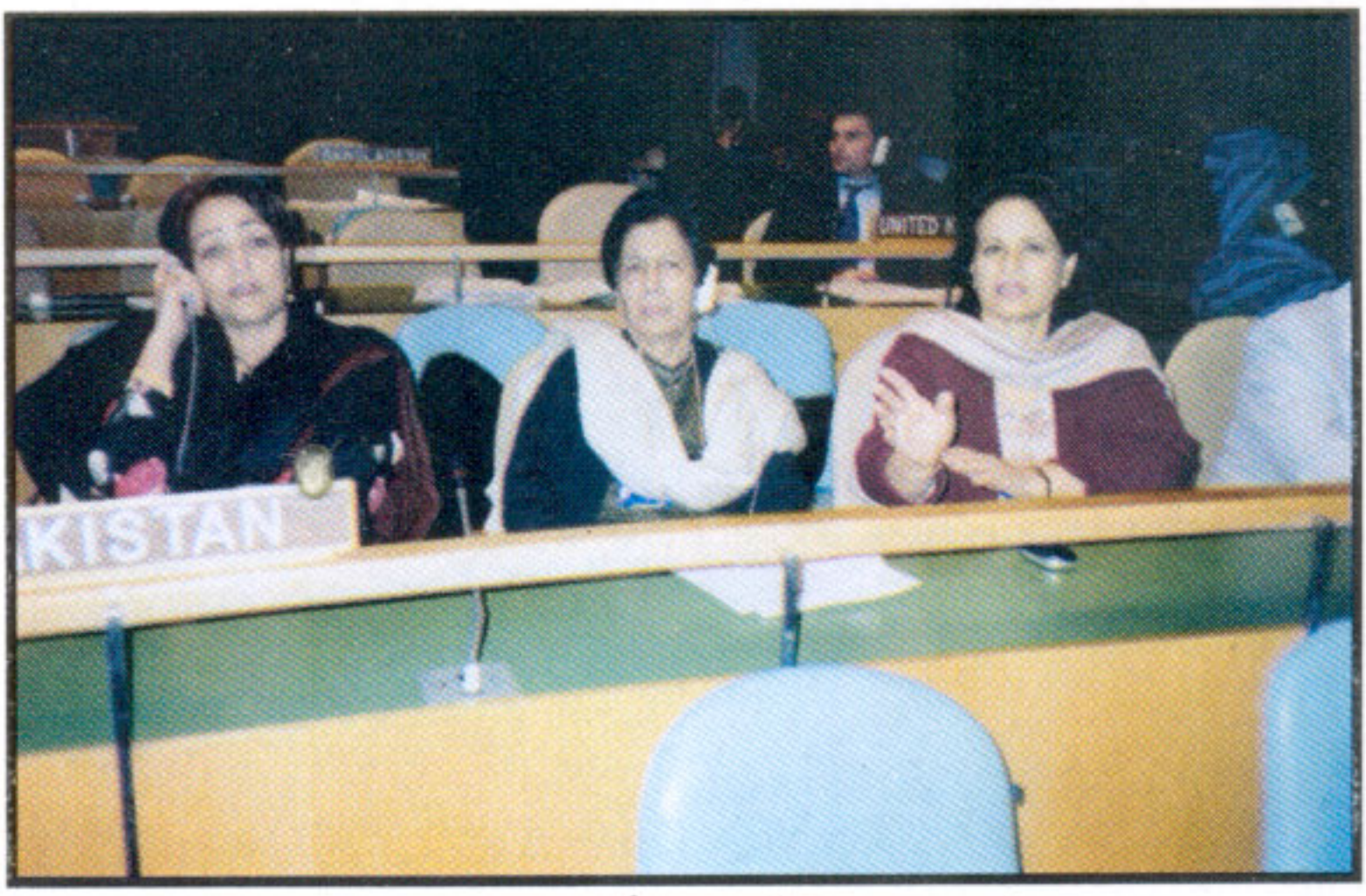
بنکاک وزٹ



نیشنل اسمبلی کا وفد آزاد جموں و کشمیر میں



قومی اسمبلی کے اجلاس کی صدارت بحیثیت چیئرمین آف پینل کرتے ہوئے



جنرل اسمبلی اقوام متحدہ میں بیگم مہناز رفیع، جسٹس ریٹائرڈ ماجدہ رضوی

اور صوبائی وزیر برائے خواتین سندھ



بیجنگ عالمی کانفرنس 1995ء



ساؤتھ ایشین پارلیمنٹیرین کے ساتھ اسلام آباد کانفرنس کے موقع پر



روس میں خواتین کی عالمی کانفرنس



وزیراعظم منموہن سنگھ، وزیراعظم شوکت عزیز، بیگم منموہن سنگھ، بیگم شوکت عزیز
محترمہ مہناز رفیع صاحبہ، لالو پرشاد یادیو



مہناز رفیع برطانیہ کے دورے میں عمر گوہر ایوب، قمر زمان کائرہ، شیری رحمٰن



خواتین کے عالمی دن پر خواتین کنونشن



نیپال میں اجلاس سے خطاب



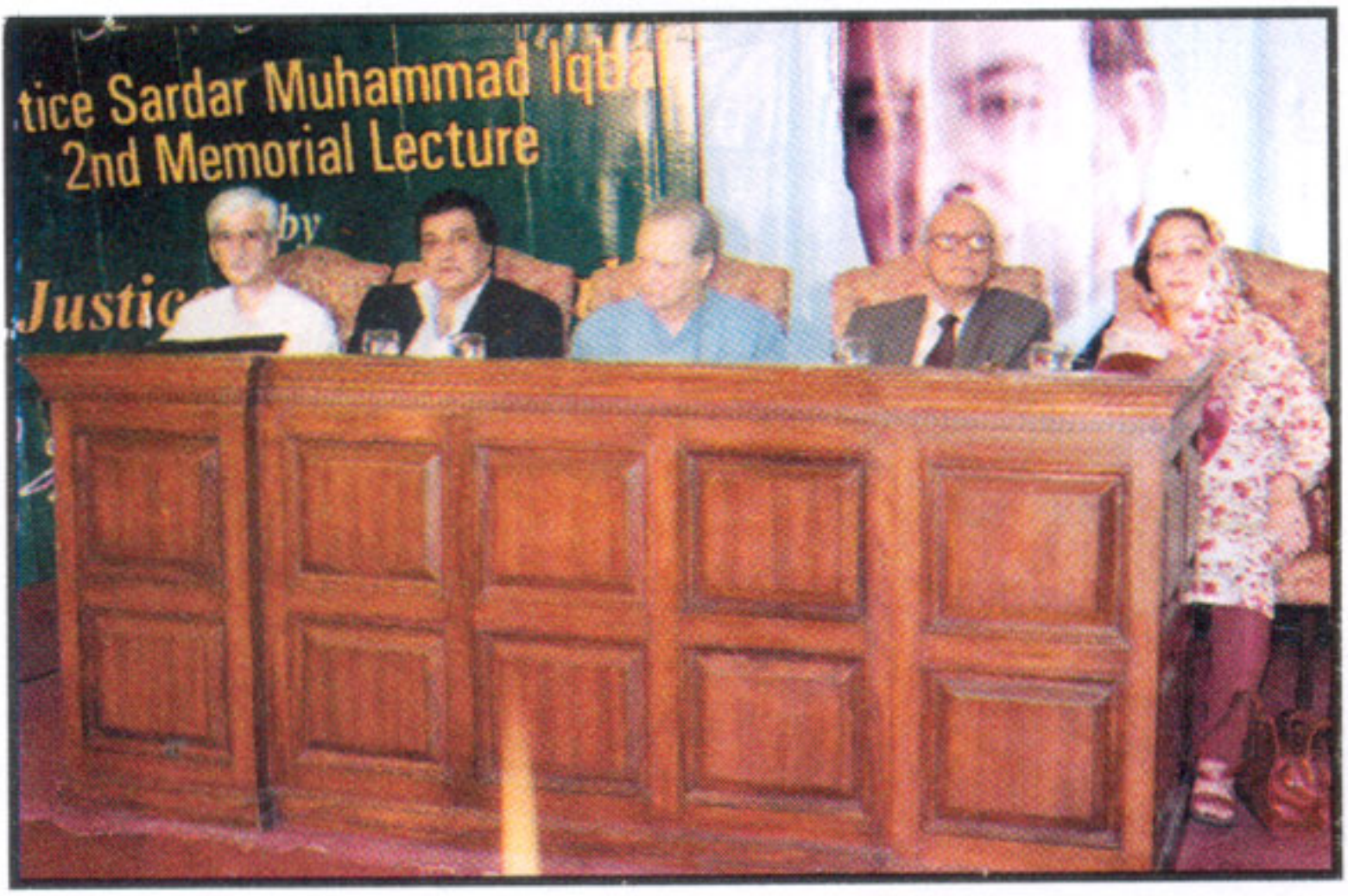
ہیلری کلنٹن (خاتون اوّل امریکہ) کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے



دورہ امریکہ ''ایشاء واچ'' کے دفتر میں



جنرل اسمبلی اقوام متحدہ میں خواتین کے ساتھ



جسٹس جاوید اقبال کی صدارت میں سیمینار کے موقعہ پر تقریب



جسٹس رانا بھگوان داس کی صدارت میں تقریب کے موقعہ پر



انسانی حقوق کے ایوارڈ کمیٹی کے اجلاس میں



ہمدرد فاؤنڈیشن کی صدر سعدیہ راشد کو انسانی حقوق کا ایوارڈ پیش کرتے ہوئے۔



سینیٹر رضا ربانی کو انسانی حقوق کا ایوارڈ پیش کرنے کی تقریب میں



تحریک انصاف کے چیئرمین عمران خان کو انسانی حقوق کا
ایوارڈ پیش کرنے کی تقریب میں



آئی اے رحمٰن کو یادگاری شیلڈ پیش کرنے کی تقریب میں



انسانی حقوق کے سیمینار میں



ہیومن رائٹس سوسائٹی کی ایک تقریب میں بیگم عابدہ حسین اور دیگر شرکاء کے ہمراہ



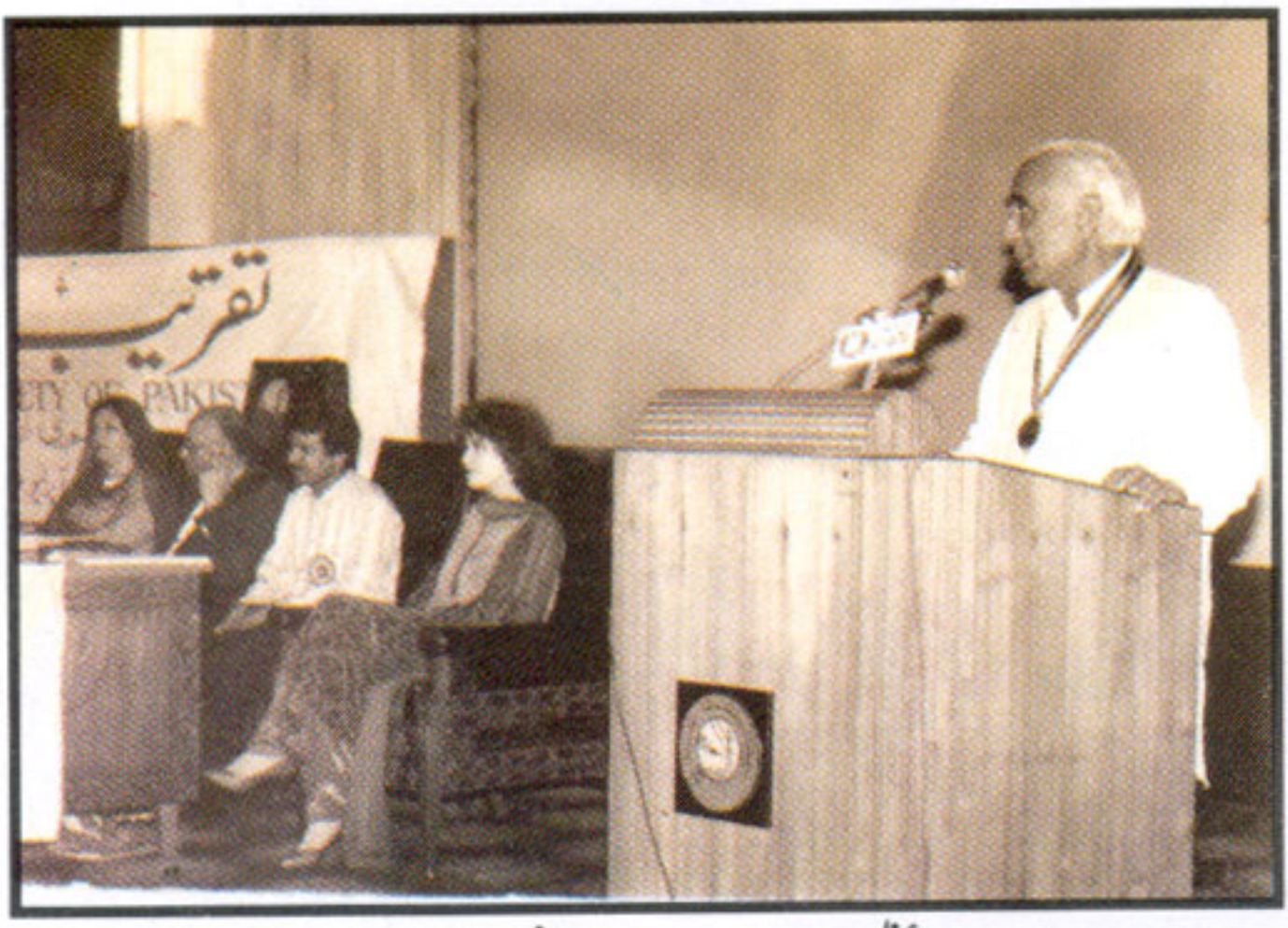
سمندر پار پاکستانیوں کے سائل پر سیمینار کے موقع پر



شوکت خانم ہسپتال کے چیف ایگزیکٹیو آفیسر ایوارڈ
وصول کررہے ہیں اس تقریب کے موقع پر



جیوٹی وی اور جنگ گروپ کے چیف ایگزیکٹو میر شکیل الرحمٰن کو ایوارڈ دینے کی تقریب میں



سابق وزیراعظم ملک معراج خالد انسانی حقوق کا ایوارڈ وصول
کرنے کے بعد خطاب کررہے ہیں مہناز رفیع سٹیج پر



سابق وزیر اطلاعات سینٹر جبار کو انسانی حقوق کا ایوارڈ پیش کرتے ہوئے۔



ایک سیمینار میں شرکت کے موقع پر



انسانی حقوق کے مجاہد ضیاء احمد اعوان کو انسانی حقوق کا ایوارڈ پیش کرتے ہوئے۔



مسلم سکھ فیڈریشن کے صدر منموہن سنگھ کے عزاز میں
تقریب سے خطاب کرتے ہوئے۔



انسانی حقوق کے اکیسویں ایوارڈ کے موقعہ پر ایوارڈ یافتگان کے ہمراہ



اجوکا تھیٹر کی مدیحہ گوہر کو ایوارڈ دینے کی تقریب میں



سوات کی طالبات ملالہ یوسفزئی کی ساتھیوں شازیہ اور کائنات کی
ایوارڈ کی تقریب میں ان کے ہمراہ



مخدوم جاوید ہاشمی کی بیٹی میمونہ ہاشمی اپنے والد کا ایوارڈ
وصول کر رہی ہیں اس تقریب کے موقعہ پر۔



عورت فاؤنڈیشن کی سربراہ بیگم نگار احمد کو ایوارڈ پیش کرتے ہوئے



معراج محمد خاں اپنا ایوارڈ ایس ایم ظفر سے وصول کر رہے ہیں مہناز رفیع ہمراہ ہیں۔



بے گناہ کشمیریوں پر مظالم کے خلاف صدائے احتجاج